جلد 7 شمارہ 10 دسمبر 2005ء شوال 1426ھ

أفلح من تزكى ○ وذكر اسم ربه فصلى ○ (الاعلیٰ 14-15)

ک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا

اللہ

محبت

صداقت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

اصلاح آدمیت
گوجرانوالہ

CPL No

Registerd

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

ماہنامہ گوجرانوالہ

آدمیت

فلاح

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 7 شمارہ 10 دسمبر 2005ء شوال 1426ھ

ایڈیٹر وحید احمد

قیمت ---------- -/20 روپے   سالانہ فنڈ ---------- -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

تعمیر ملت نزد توحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:055-3862835

Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:055-3881379

Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020

E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ)

روزے:۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

یایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون٥

"اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کئے گئے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"۔ (البقرہ:183)

ممتاز عالم دین علامہ عبداللہ یوسف علی قرآن کے انگریزی ترجمہ میں کہتے ہیں کہ جس طرح ایک ڈاکٹر مریض کے لئے نسخہ لکھ دیتا ہے، بالکل اِسی طرح یہ نسخہ ہے تاکہ تم میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ روزے کی حقیقت تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے مہینہ بھر یہی مشق کراتے ہیں کہ اگر ہم کہیں کہ کھانا پینا ترک کر دو تو تمہیں ترک کرنا پڑے گا۔ ہم کہیں کہ کھانا شروع کر دو تو کرنا پڑے گا۔ ہم تمہیں حلال سے روکیں تو رُک جاؤ تاکہ بعد میں جب ہم تمہیں حرام سے روکیں تو یہ بات تمہارے لئے مشکل امر نہ ہو اور رزق حلال اور رزق حرام سے باز آنا رمضان کی تربیت کا نتیجہ ثابت ہو:۔

رمضان وقرآن کا باہمی تعلق

شھر رمضان الذی اُنزل فیه القران ھدی للناس و بینت من الھدی والفرقان٥

"رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔ لوگوں کیلئے اِس میں ہدایت ہے۔ کھلی نشانیاں اور حق وباطل کی تمیز ہے"۔ (البقرہ:185)

قرآن مجید کا رمضان المبارک سے اور رمضان المبارک کا قرآن مجید سے ایک گہرا تعلق اور نسبت ہے۔ احادیث مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ اِس سے پہلے آسمانی صحائف بھی رمضان المبارک میں نازل ہوئے۔ اِس لئے رمضان المبارک میں اگر کوئی شخص قرآن مجید کو کان کھول کر

سنے گا، آنکھیں کھول کر پڑھے گا تو اس کو زیادہ فائدہ ہوگا اور قرآن مجید کا نزول بھی آنکھیں کھول کر پڑھنے کے لئے ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

قد جاء کم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها وما انا علیکم بحفیظo

''تمہارے پاس اللہ کی نشانیاں آ گئی ہیں جس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس میں اس کا اپنا ہی بھلا ہے اور جو اندھا بنا رہا اُس کا وبال بھی اُسی پر ہے''۔(الانعام:105)

یوں قرآنِ مجید رمضان المبارک کی خصوصی غذا ہے۔ قرآن مجید کو کثرت سے اور سمجھ کر پڑھنا چاہئے۔

حضرت عباسؓ کا قول ہے۔''قرآن مجید تھوڑا اگر سمجھ کر پڑھو''۔

حضور اکرمؐ کا ارشاد ہے آپؐ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا:۔

یااباذر لان تغدو تتعلم ایۃ من القران خیرلك من ان تصلی مائۃَ رَکْعَۃِo

''اے ابوذر! اگر صبح اُٹھ کر تم قرآن پاک کی ایک آیت (علم وفکر کے ساتھ) سیکھ لو تو یہ تمہارے لئے سو رکعت نفل نماز سے افضل ہے''۔(ابوداؤد)

رمضانُ المبارک کی برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے کہ اِس ماہ مبارک میں قرآن مجید کو سمجھنے کی توفیق بڑھ جاتی ہے۔

حقیقت حج

روزوں کے بعد سورہ بقرہ میں اسلام کے پانچویں رُکن یعنی حج کے متعلق ضروری احکام ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحجo

''حج میں نہ شہوت پرستی کریں، نہ گناہ اور نہ جھگڑا''۔(البقرہ:197)

بالفاظ دیگر حج میں شہوت پرستی اور گناہ وفساد جیسے واقعات رونما ہوں گے تو پھر حج حج نہیں رہے گا۔ اِسی لئے حضورﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے حج کیا اور ان تمام چیزوں سے بھی اجتناب کیا تو حج کے بعد وہ یوں پاک وصاف ہوگیا جیسا کہ آج ہی بطن مادر سے پیدا ہوا ہو۔

دین ودنیا کا ملاپ

مناسک حج بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہمیں ایک دُعا سکھاتے ہیں لیکن اس سے قبل ایک دُعا پر تنقید کرتے ہیں کہ اگر اِس دنیا میں رہتے ہوئے دُنیا ہی مانگتے رہو گے تو موت کے وقت یہاں سے خالی ہاتھ ہی جاؤ گے، اِس لئے اللہ تعالیٰ سے دین ودنیا دونوں مانگا کرو اور یوں کہا کرو۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار٥

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں اِس دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرما اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھ''۔(البقرہ:201)

یہاں اِس امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر آخرت بنانا ہے تو دنیا کا ستیاناس کرنا پڑے گا اور اگر دنیا بنانا ہے تو آخرت کو فراموش کرنا پڑے گا۔لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ آخرت اِسی دنیا کے ذریعے بنتی ہے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

وابتغ فیما اتک اللّٰه، الدار الاخرة ولا تنس نصیبك من الدنیا٥

''اور جو(مال)تم کو اللہ نے عطاء کیا ہے،اِس سے آخرت(کی بھلائی)طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائیے''۔(القصص:77)

دنیا میں یہ جو مال ودولت ہے،کار اور کوٹھی ہے، بیوی اور بچے ہیں یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اِنہی کے ذریعہ سے آخرت کمانا ہے۔آخرت دنیا کے راستے ہی سے کمائی جائے گی۔دنیا سے ہٹ کر نہیں کمائی جاسکتی۔

یہ مفروضہ ایک بہت بڑا دھوکا ہے کہ آخرت حاصل کرنے کیلئے دنیا چھوڑ دیں۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو گویا اپنے ہتھیار ہی چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ آخرت تو ہمیں دنیا کے ذریعے ہی سے کمانا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ دُنیا دُنیا نہیں جس میں دین نہیں جو دُنیا سے کٹا ہوا ہو، وہ رہبانیت ہو گی۔ جب دین و دنیا کا ایک متوازن قسم کا امتزاج بنتا ہے تو کامل زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً ہم زندہ ہیں کیونکہ ہمارا جسم ہے اور اِس کے اندر جان ہے۔ جسم اور جان جب تک اکٹھے ہیں، تب تک ہم زندہ ہیں۔ اِس جسم سے اگر روح جدا ہو جائے تو یہ موت ہو گی۔ بالکل اسی طرح دین ہماری رُوح اور دُنیا ہمارا جسم ہے۔ اِن دونوں کو اکٹھا کریں گے تو زندگی ہو گی ورنہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔

متوازن نظامِ تعلیم

اِسی بات کو اگر ہم اپنے نظامِ تعلیم کے حوالے سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نظامِ تعلیم جس میں دین کو دنیا سے جدا کر دیا جائے یا دینی تعلیم کو سائنسی علوم سے بالکل علیحدہ کر دیا جائے تو وہ دینی و دُنیوی تعلیم دونوں ناکافی ہوں گی۔ اِس لئے دینی تعلیم میں اگر جدید علوم کے مسائل شامل نہ ہوئے تو اجتہاد ممکن نہ رہے گا اور دُنیوی تعلیم میں اگر دین نہ ہوگا تو انسان اچھا انسان نہ بن سکے گا۔ آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی اولاد ڈاکٹر، انجینئر، ٹیکنوکریٹ، بیوروکریٹ اور پارلیمنٹیرین بنے، آپ کی تمام خواہشات اپنی جگہ قابل احترام سہی لیکن اِس سے قبل اُسے ایک اچھا انسان اور صحیح مسلمان بننا چاہئے۔ اِس مقصد کیلئے آپ کو دین و دُنیا کی تعلیم دونوں اکٹھے دینا پڑے گی۔ اِس معاملے میں جہاں بھی تفریق کریں گے تو بات نہیں بنے گی۔ سکول اور کالج میں پڑھنے والا بچہ ایک اچھا مسلمان نہیں بن سکے گا۔ اِسی طرح دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والا ایک عالم دین دُنیا میں اپنے دین کو نافذ نہیں کر سکے گا۔ ایک شخص جو سکول اور کالج میں تعلیم حاصل کرتا ہے اُسے اُن مسائل کا بخوبی علم ہو جاتا ہے جس سے اِس وقت پوری انسانیت دوچار ہے لیکن اِس کے پاس ان کا کوئی حل نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں جو شخص دینی مدارس میں پڑھتا ہے اِس کے پاس ان مسائل کا حل موجود ہے۔ لیکن اِسے عصر حاضر کے پیدا شدہ مسائل کا ادراک نہیں کیونکہ اِسے جدید معیشت، بینکنگ اور دوسرے مسائل سے آگاہ نہیں کیا جا رہا ہے۔

اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ جدید تعلیم سے فارغ التحصیل طالب علم کے پاس مرض کی تشخیص تو ہے مگر علاج نہیں۔ اِدھر ہمارے دینی مدرسے کے طالب علم کے پاس علاج موجود ہے لیکن مرض کی تشخیص کا ڈھنگ نہیں، سوائے اِن چند لوگوں کے جو محقق، سکالر یا عالم ہیں۔ جب تک دین و دُنیا کو یکجا و یکجان نہیں کیا جائے، مرض کا علاج ممکن نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پہلے دنیا کی بات کرتا ہے اور پھر آخرت کی۔

ملاحظہ فرمائیں:۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنه o

"اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطاء فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما"۔ (البقرہ:203)

ذکرِ الٰھی و عبادت

قرآن پاک میں ذکرِ الٰہی کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

فاذا قضیتم الصلوة فاذکروا الله قیاما و قعودا وعلی جنوبکم o

"جب تم نماز پوری کر چکو تو اللہ کے ذکر میں کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے لگے رہو، ہر حال اور ہر آن اللہ کو یاد کرتے رہو"۔ (النساء:103).

ہمیں ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہنا چاہئے تاکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے سلسلہ جنبانی جاری و قائم رہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:۔

ذکر اُو سرمایہ ذوق و سرور
لذت سوز و سرور از لا اِلٰہ
در شب اندیشہ نور از لا اِلٰہ

جب اللہ اور اُس کے رسولِ مقبولؐ سے محبت ہو جائے اور اُن کے عشق کی چنگاری دِل میں سلگ اُٹھے تو پھر یہ دِل دیوانہ اُنہی کا ہو جاتا ہے اور پھر ماسوا اللہ کے کسی اور کی یاد بھی نہیں آتی۔

گفتگو کسی سے ہو، تیرا دھیان رہتا ہے

ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

گاؤں میں عورتیں کنوئیں یا پنگھٹ سے پانی لے کر سر پر گھڑے رکھے دور دور تک جاتی ہیں۔ بلندی چڑھتے اور اُترائی اُترتے ہوئے وہ اٹھکیلیاں کرتی جاتی ہیں۔ باہمی باتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، قہقہے بھی لگتے ہیں لیکن ان کا ہر قہقہہ بھی نپا تلا ہوتا ہے اور ہر قدم بھی۔ اس لئے کہ دل میں یہ دھیان ہوتا ہے کہ سر پر گھڑا ہے، کہیں گر نہ جائے۔ ایک لمحہ کو بھی دل سے یہ دھیان محو نہیں ہوتا۔ اسی دھیان کو ہم ''فکر'' کہتے ہیں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ

دل بہ یار، دست بہ کار

اہل دل اور اللہ والے اِسے مراقبہ کہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:۔

درمیان کار زار کفر و دین
با دِل خودیک نفس خلوت گزیں

یہی وہ خلوت گزینی ہے جو دھیان کو پختہ کرتی ہے اور دل میں یادِ الٰہی کی جوت جگاتی ہے۔

اِس کا تعلق فقط سوچ سے نہیں بلکہ دل کی دنیا سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کا جذبہ پیدا کریں۔ بلکہ اصل میں تو محبت وہی کرتا ہے، محبت کا سراپا تو وہی ہے، اِس نے اپنی محبت کو سو حصوں میں بانٹا، ننانوے آخرت کیلئے رکھ چھوڑے اور ایک حصے کو پوری کائنات میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ دنیا بھر کی ماؤں کی محبت، باپوں کی شفقت، حیوانوں کی محبت اور چرند پرند کی باہمی اُلفت بن گیا۔ یہ سب محبت اُسی جلہ جلالہ کی دی ہوئی ہے۔ وہ تو رحمٰن و رحیم اور محبت کا سراپا ہے۔ ہمیں تو سوئچ کرنا پڑے گا۔ پھر اُس کی محبت کے دم بہ دم پیہم چھانے کے منظر نظر آئیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے فضاء میں ریڈیائی لہریں موجود ہیں۔ آپ جونہی ریڈیو سوئچ آن کرتے ہیں، آواز آنے لگتی ہے اور اگر آپ سوئچ آف کرتے ہیں تو آواز آنا بند ہو جاتی ہے۔ اللہ کی محبت کا سوئچ آن کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ سے اُس کی ذات کو مانگنے کی ضرورت ہے:۔

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو، کہ سبھی کچھ مل جائے
سو سوالوں سے مرا ایک سوال اچھا ہے

کچھ اور مانگنا مرے مذہب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے مرے دستِ سوال میں

صرف اس جل جلالہ سے مانگنا پڑے گا۔ اِس کے بعد صورتِ حال بالکل برعکس ہو جائے
پھر آپ کو کوشش کر کے دھیان اِدھر اُدھر لانا پڑے گا۔ یعنی دنیا کی طرف توجہ کے لئے بھی
کوشش کرنا پڑے گی اور یہ کیفیت ذکرِ الٰہی کی کثرت سے پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون o ما اُرید منھم من رزق وما اُرید ان یطعمون o

"میں نے جنات اور انسانوں کو اِس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں اِن سے رزق کا طالب نہیں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں"۔ (الذاریات 56-58)

یہاں رزق کمانے سے نہیں روکا جا رہا، لیکن یہ اصل ذمہ داری نہیں۔ اصل ذمہ داری تو اللہ کی معرفت، محبت اور اُس کے دین کو نافذ کرنا ہے اور یہی خلیفۃ الارض کا کام ہے کیونکہ جب وہ اللہ کا تفویض کردہ کام کرے گا تو اُسے رزق ضرور ملے گا۔

اکبر الٰہ آبادی کہتے ہیں:۔

رزق ما یحتاج مل ہی جائے گا
خواہشوں میں مختصر ہو جایئے
فقر سے شیطاں ڈراتا ہے اگر
حسبنا اللہ سے نڈر ہو جایئے

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔

پھر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:۔

یسئلونك ماذا ینفقون ۔ قل العفو

''لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کون سا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو''۔ (البقرہ:219)

یہاں پر بعض لوگ اِس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ گھر کے دال دلیہ سے جو زائد بچتا ہو، وہ سب کا سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ اگر یہ درست ہے تو پھر زکوٰۃ کا کیا جواز ہوگا؟ کیونکہ اگر ہم گھر میں کچھ بچا کر نہیں رکھ سکتے تو پھر زکوٰۃ کے تمام احکامات کا نفاذ کہاں ہوگا؟ دراصل صحابہ کرامؓ میں سخاوت کا ایک جوش و جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ خود تنگی کی حالت میں ہوتے اور اپنی ضرورت سے زیادہ دوسرے کی ضرورت کا خیال رکھتے۔ اپنے بیوی بچوں کو بھوکا رکھتے اور ان کی ضروریات کو موخر کر دیتے لیکن ہمسائے، اقارب اور دوستوں کی ضرورت کا خیال اولاً کرتے۔ قرآن مجید نے کہا ہے کہ خاندان ایک وحدت ہے۔ خاندانوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اولین درجہ پر ہے اس لئے پہلے اُسے پورا کرنا چاہئے اور اُس میں سے ایک جو بچ جائے وہ دوسروں پر خرچ کرنا چاہئے۔ جب تک کہ یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ والدین کو صحیح کھانا مل رہا ہے، اُس وقت تک خود لقمہ کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ والدین کا حق اپنی ذات اور اپنے بیوی بچوں سے زیادہ ہے۔ بالکل اسی طرح اپنے اہل و عیال کے حقوق جب تک پورے نہ ہوں، مال کو صدقات و خیرات میں دینا جائز نہ ہوگا۔

مرد و زن۔ ایک دوسرے کا لباس

حقوقِ نسواں:۔

سورہ بقرہ میں دوسرے احکام کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حقوق کے متعلق بھی واضح احکام آ گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

ولهن مثل الذی علیهن بالمعروف٥

''جو مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، وہی عورتوں کے مردوں پر ہیں''۔ (البقرہ:228)

یعنی نہ تو مردوں کے کوئی خصوصی حقوق ہیں نہ عورتوں کے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کے ہاں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اِس فن پارے میں عورتوں کے حقوق اس خوبصورتی سے بیان کئے گئے ہیں کہ اگر انہیں انسان ساری زندگی بیٹھ کر سوچتا رہے تو وہ اِس ایک آیت سے بہتر بات نہیں لکھ سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

هن لباس لكم وانتم لباس لهن ٥

"تمہاری عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم اُن کا لباس ہو"۔ (البقرہ:187)

اس سے بہتر اور عمدہ مثال ممکن ہی نہیں۔ میرے خیال کے مطابق یہ آیت قرآنی معجزات یں سے ایک معجزہ ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ادیب یا محقق عورتوں کے حقوق بیان کرتے ہوئے اس سے اچھا جملہ شاید ہی لکھ سکے بلکہ وہ یقیناً نہیں لکھ سکے گا۔ اِس لئے کہ قرآن نے بلاوجہ و چیلنج نہیں دیا کہ تم قران کے مقابلے میں ایک سطر ہی لکھ کر دکھادو۔ قرآن پاک نے مرد وزن ونوں کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ جس طرح لباس انسان کا دفاع کر کے اِسے گرمی اور ردی سے بچاتا ہے۔ لباس انسانی جسم سے قریب ترین چیز ہے اور اِنتہائی قرب کی علامت ہوتا ہے۔ لباس انسان کی عزت کی علامت بھی ہوتا ہے۔ کسی شخص کے گریبان پہ ہاتھ ڈالنا اُس کی زت پر ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ لباس انسان کی زینت بھی ہوتا ہے۔ لباس انسان کے یوب اور ستر کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں لباس اُس کی پہچان کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ یہی مام کام میاں بیوی بھی ایک دوسرے کے لئے سرانجام دیتے ہیں۔ مرد وزن مُشکلات میں ایک وسرے کا دفاع بھی کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی برائیوں اور خامیوں کی پردہ نوشی بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی پہچان اور زینت کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے انتہائی رب، محبت اور عزت کی علامت اور اُن کا محکم ذریعہ ہوتے ہیں۔ اِسی لئے قرآن پاک نے ردوزن میں اِس لحاظ سے کوئی فرق نہیں رکھا۔ اور کہا کہ جو حقوق مرد کے عورت پر ہیں، وہی ورت کے مرد پر ہیں۔ ہاں مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے اور وہ اس وجہ سے کی یہ رد کے ذمہ ہے کہ وہ بحیثیت ولی الامر تمام زندگی کمائی کھلاتا رہے۔

دنیائے فلسفہ میں طویل عرصہ یہ بحث چلتی رہی کہ عورت بھی انسان ہے کہ نہیں؟ اور اس بات ر دلائل کے انبار لگا دیئے گئے کہ عورت انسان ہی نہیں، یہ روح سے خالی محض جسم ہے۔ یہ قابل خرید وفروخت ہے۔ اہل ایران عورت کو "زن" کہتے ہیں یعنی "مار" "مزن" نہیں کہتے کہ "نہ مار" اور انگریزی میں اسے **Women** یعنی **Wo for man** مرد کے لئے غم و مصیبت۔ فرانس میں پہلی مرتبہ 586ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ عورت انسان ہے، لیکن اِسے مرد کی خدمت کیلئے بنا گیا ہے۔ اسلام اِس لغو نظریئے کا حامی نہیں۔ اگر عورت مرد کی خدمت کیلئے ہے تو مرد عورت ک

خدمت کیلئے کیوں نہیں؟ میرے خیال میں دونوں کوایک دوسرے کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں عبادت ومعاشرت اور زندگی کے ہر کام کیلئے ایک ترتیب اور ضابطہ ذکر کر دیا گیا ہے۔ جب تک انسانی معاشرہ اِس ترتیب کے مطابق چلتا رہا، عظمت واقبال نے اِس کے قدم چومے۔ قرآن مجید میں اِس مقام پر بنی اسرائیل کی ذِلت و رسوائی کی داستان کو ہماری رہنمائی کیلئے ذکر فرمایا کہ جب بنی اسرائیل نے احکامِ الٰہی کی ترتیب کو اُلٹ دیا تو ذِلت اُنکا مقدر ہوئی۔ مالی برتری اُن کے ہاں عظمت کا سبب سمجھی جاتی تھی جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان، واعمال صالح کو فوقیت دی ہے۔

طبقات پرستی

ترتیب اُلٹنے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے طالوت کو اُن کا حکمران بنا دیا۔ اِس پر وہ کہنے لگے کہ اِس غریب آدمی ہی کو حکمران اور رہنما بنانا تھا۔ اِس سے معلوم ہوا کہ یہ طبقات پرستی کی بیماری آج کی نہیں بلکہ بہت پرانی ہے۔ یعنی یہ لیڈر شپ کا تصور کہ لیڈر جب بھی بنے گا، وہ وڈیرا ہوگا، سرمایہ دار ہوگا یا جاگیردار ہوگا اور طالوت جیسی شخصیت کبھی بھی لیڈر بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اُسے دو نعمتوں سے نوازا ہے۔ صحیح جسم ودماغ اور صحیح علم! یعنی اُسے صحت مند جسم اور علم عطاء کیا ہے، اِس لئے اُس کو حکمران بنا دیا ہے۔ اصل فضیلت اُس کے علم کی ہے۔ اُس کو اپنا حکمران تسلیم کرو اور اُس کیساتھ مل کر جہاد کرو۔

نافرمانی اور پست ہمتی

اُنہیں حکم ہوا کہ جہاد کے دوران میں تم اِس دریا کے کنارے اِس کا پانی پینے سے پرہیز کرو۔ چند گھونٹ پی لو تو کوئی حرج نہیں لیکن سیر ہو کے نہیں پینا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جنہوں نے پانی نہیں پیا یا بہت کم پانی پیا۔ اکثر نے اللہ کی نافرمانی کر دی جس کے نتیجے میں دشمن جالوت سے لڑنے کی طاقت نہ رہی۔ اُس سے یہ ظاہر ہوا کہ انسان اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کرے تو اُس کی تمام قوت وطاقت زائل اور ہمت پست ہو جاتی ہے۔ ہرچند کہ پانی قوت حیات کا سرچشمہ ہے مگر اِس دریا کا پانی اُن کیلئے نقصان دہ اِس لئے ہو گیا کہ پانی پینے کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی تھی اور قوت کا سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ یہ قوت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

روحانیت

(قبلہ محمد صدیق ڈار توحیدی)

اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو جتنی بھی قوتیں عطا کر رکھی ہیں وہ انسان کی بہتری کے لئے ہی ہیں۔ ان تمام قوتوں کو اِس ڈھنگ سے اِستعمال کرنا کہ فائدہ زیادہ سے زیادہ اور نقصان کم سے کم ہو نسان کی کامیابی کی راہ ہے۔ اللہ کی دی ہوئی شریعت کسی بھی قوت کو ضائع کرنا نہیں چاہتی بلکہ ں سے زیادہ سے زیادہ تعمیری کام لینا چاہتی ہے۔ وہ خواہشات اور جذبات کو مٹانے کی بجائے نہیں حدود و قیود میں رکھنے کا حکم دیتی ہے۔ وہ مومن کو یہ بتاتی ہے کہ تیرے جسم کا بھی تجھ پر حق ہے، تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے، بلکہ تیرے گھر آئے ہوئے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے اور ساتھ ہی تفصیلی ہدایات بھی دیتی ہے کہ یہ حقوق کیا ہیں اور انہیں ادا کرنے کا احسن طریقہ کیا ہے۔ اِن حقوق کے ادا کرنے پر بھی روحانی ترقی کا انحصار ہے۔ اللہ کے ین کی تعلیم اِس قدر متوازن ہے کہ بنی نوع انسان کے لئے از سر تا پا خیر ہی خیر بن گئی ہے۔ وحانیت کے حصول کے جو طریقے بتائے گئے ہیں وہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ں۔ اِسلام میں روحانی ترقی اور اللہ کی مغفرت حاصل کرنے کے لئے یہ تعلیم ہرگز نہیں دی جاتی ہ اپنے جسم کو مسلسل فاقوں اور چلّہ کشی کی مشقوں سے کمزور اور بیکار بنا دو، مسلسل روزے رکھو، اری رات نوافل پڑھنے میں گزار دو، شادی نہ کرو، چپ کے روزے رکھو، ننگے رہو، دنیا کو چھوڑ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھو یا حبس دم کی ریاضتوں میں پڑ کر سانس لینا بھی بند کر دو۔ لام اِس دنیا میں رہتے ہوئے زندگی گذارنے کا ایسا لائحہ عمل عطا کرتا ہے جس پر عمل کیا جائے تو ن دنیا کی تمام لذتوں سے متمتع ہوتے ہوئے اور تمام حقوق احسن طریقے سے ادا کرتے ئے اللہ کے انتہائی قرب کی منازل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول لسلام کے چند اصحابہ نے اللہ کی رضا کے حصول اور روحانی ترقی کے شوق میں شادی نہ کرنے، ری رات اللہ کی عبادت کرنے اور مسلسل روزے رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ آپ کو اِن کے ارادوں ے بارے میں اطلاع ہوئی تو اِن اصحاب کو طلب کر کے پوچھا کہ کیا تم نے ایسا ایسا ارادہ کیا ہے۔

انہوں نے اس امر کا اقرار کیا تو آپ ﷺ نے انہیں اس طرز زندگی سے روکتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا شادی نہ کرنے سے حاصل ہو سکتی تو اس پر سب سے پہلے میں عمل کرتا کیونکہ میں اللہ کا رسولؐ ہوں۔ میری بیویاں بھی ہیں اور میرے بچے بھی ہیں۔ اگر اللہ کا قرب ساری رات جاگ کر نوافل ادا کرنے سے حاصل ہو سکتا تو سب سے پہلے میں یہ کام کرتا کیونکہ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں۔ میں رات کو سوتا بھی ہوں اور پچھلی شب اٹھ کر تہجد بھی ادا کرتا ہوں۔ اگر اللہ کی محبت مسلسل روزے رکھنے سے مل سکتی تو سب سے پہلے میں اس پر عمل کرتا کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں نفلی روزے رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں۔ کیا تمہیں میرا طریقہ پسند نہیں ہے؟

اسلام میں جس طرح دوسری نعمتوں اور مال و دولت کے حصول کیلئے قواعد وضوابط مقرر ہیں اور حلال وحرام کی پابندیاں عائد ہیں اسی طرح روحانیت کے حصول کی خاطر رہبانیت اختیار کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ دنیا کی دولت بھی ایک نعمت ہے لیکن زیادہ دولت اکٹھی کرنے کے لئے جس طرح ناجائز ذرائع اختیار کرنا جرم ہے اسی طرح زیادہ روحانی ترقی حاصل کرنے کی خاطر دنیا کو ترک کر دینا حرام قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ رہبانیت سے نہ صرف اپنے نفس کے حقوق ضائع ہوتے ہیں بلکہ معاشرہ کے حقوق بھی تلف ہوتے ہیں اور دنیا کے نظام میں فساد پیدا ہوتا ہے۔

جیسا کہ حیات ارضی کے باب میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ دنیا کی زندگی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے۔ ہم یہاں محنت کر کے جو کچھ بوئیں گے آخرت کی زندگی میں اسی کی فصل کاٹیں گے۔ اگر ہم کھیتی کو نظر انداز کر کے اور کاشت کے کام کو ترک کر کے یہ زندگی کسی خانقاہ میں بیٹھ کر مراقبوں، چلوں اور گیان دھیان میں ہی گزار دیں تو اس زندگی میں کیا صلہ پائیں گے۔ قرآن کی تعلیم تو یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے وہ انسان کیلئے بنایا گیا۔ اور انسان کو پیدا ہی اس زمین پر حکمرانی کیلئے کیا گیا ہے۔ اس لئے سچا دین وہی ہے جو انسان کو اللہ کے عطا کردہ خلافت ارضی کے منصب کیلئے تیار کرے تاکہ وہ یہاں کی تمام مادی اور غیر مادی قوتوں کو تسخیر کر کے ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکے اور اللہ تعالیٰ نے جو اسے

فضیات عطا کر رکھی ہے اسے بروئے کار لا کر اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سفر میں آگے بڑھتا چلا جائے اور اللہ تعالیٰ کا قرب اور دیدار حاصل کر سکے۔ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے مسجود ملائکہ بنایا اگر وہ زمینی قوتوں کو زیر فرمان لانے کے لئے جدوجہد ہی نہ کرے یا انہیں اپنی اطاعت میں لگانے میں ناکام رہے تو اسے رب العالمین کی خوشنودی کیونکر حاصل ہو سکے گی۔ اس لئے اللہ کا دین نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی اس میں غرق ہو جانے کو پسند کرتا ہے۔

بلکہ ایک متوازن اور حقیقی کامیابی کا ضامن لائحہ عمل عطا کرتا ہے۔ اور اس روحانیت کی تعلیم دیتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ جوہر نارروا مشقتوں میں پڑے بغیر قلیل مدت میں ہی اپنے کمال کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ مسلک اللہ کے قرب و رضا کو مقصود حیات قرار دے کر کائنات کو تسخیر اور انسانیت کی خدمت کرنے کا ہے۔ مادی دنیا کی تعمیر و تسخیر اور اختراعات و ایجادات کی جدوجہد میں مومن کا جھپٹنا پلٹنا بھی خون گرم رکھنے کیلئے ہوتا ہے تاکہ منزل کبریا کی طرف اس کی پرواز میں کسی قسم کی کوتاہی واقع نہ ہو۔ اس سفر میں مومن کے کمالات کی حد برق و بخارات سے چلنے والی مشینوں پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ جمادات، نباتات، اور حیوانات اور دیگر مادی قوتوں پر تصرف حاصل کرنے کے بعد مزید آگے بڑھ کر روحانی لطافت کے ذریعے زمان و مکان پر دسترس حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے خصوصی تعلق رکھنے کی بناء پر مومن آفاق میں گم نہیں ہو جاتا بلکہ آفاق اِس کے قلب کی وسعت میں گم ہو جاتے ہیں۔ مومن جب اللہ کے نور سے دیکھنے لگ جاتا ہے تو وہ زمان و مکان کی حدوں کو پھلانگ جاتا ہے اور اس کیلئے دور و نزدیک اور ماضی و مستقبل سب سمٹ کر ایک نکتہ بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اِس کے قرب کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ مومن میں اللہ کی صفات کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ جس طرح لوہے کا ایک ٹکڑا آگ کی بھٹی میں تپ کر سراپا آگ بن جاتا ہے۔ آگ کی حرارت اِس کے ذرے ذرے کے اندر سرایت کر جاتی ہے تو وہ صورت اور سیرت میں آگ ہی بن جاتا ہے۔ وہ دیکھائی بھی آگ کی طرح دیتا ہے اور جلاتا بھی آگ کی طرح ہے۔ اِس کیفیت کو وحدت الوجود کا دھندا نہ بنایا جائے کیونکہ لوہا آتش صفت ہوتے ہوئے بھی لوہا ہی رہتا ہے۔ الغرض بندہ مومن شدت محبت سے مولا صفات بن جاتا ہے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ کے خاص بندے وہ ہیں کہ جنہیں دیکھ کر اللہ یا

آئے۔ ایک حدیث قدسی ہے کہ جب بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔
اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو علم لدنی یعنی اپنی طرف سے خصوصی علوم اور اپنے فضل سے ایسی روحانی طاقتیں عطا فرماتا ہے کہ عام انسانوں کے لئے ان کو سمجھنا یا احاطہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اِن خاص الخاص بندوں کا ذکر جا بجا فرمایا ہے اور اپنے فضل سے جو معجزات اور نعمتیں انہیں عطا فرمائیں اِن کا اجمالی نقشہ اِس طرح اُبھرتا ہے کہ اِن کی فرماں روائی انسانوں کے علاوہ جنگلی درندوں، آبی و ہوائی جانوروں اور جنات تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا کو اِن کے لئے مسخر کر دیا گیا تھا۔ وہ اِن کے حکم پر چلتی اور ان کا تخت ہوا کے دوش پر سفر کرتا تھا۔ وہ چیونٹیوں اور پرندوں کی زبان سمجھتے اور اِن سے گفتگو کر سکتے تھے۔ وہ دور دراز مقامات سے بڑے وزنی مادی اجسام کو روحانی قوت کے بل بوتے پر پلک جھپکنے میں لا حاضر کرنے پر قادر تھے۔ اِن کی نظریں تحت زمین اور عرش بریں دونوں کا مشاہدہ کر سکتی تھیں۔ وہ ماضی اور مستقبل کے اندر جھانک کر ازلی و ابدی حقائق سے آشنا ہو سکتے تھے۔ اِن کی دُعا سے آسمان سے من و سلویٰ نازل ہوتا اور دھوپ سے بچانے کیلئے بادلوں کے سائبان اِن کے سروں پر سایہ مہیا کرتے۔ اِن کا عصا اِن کے ارادہ کے تحت اژدہا بن جاتا اور جب اِسے اپنے ہاتھ میں لے لیتے تو پھر عصا کی صورت اختیار کر لیتا۔ اِن کے عصا کی ضرب سے پتھروں سے چشمے جاری ہو جاتے اور دریا کا پانی رُک جاتا۔ اِن کی خدمت میں بے موسم کے پھل پیش کئے جاتے۔ انہیں خوابوں کی تعبیر اور کئی دوسری علوم عطا کئے گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فیصلوں کا نفاذ اِن کے ہاتھوں سے کراتا۔ وہ عجوبہ روزگار بزرگ کہیں یتیم کی کشتی توڑ کر، کسی معصوم جان کو قتل کر کے اور کبھی کسی مومن کے یتیم بچوں کے خزانے کی حفاظت کی خاطر دیوار تعمیر کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اللہ کے اذن سے پیدائشی اندھوں اور کوڑھیوں کو اپنے مبارک ہاتھوں کے لمس سے شفایاب کرنے اور مُردوں کو زندہ کر دینے پر قادر تھے۔ وہ مٹی سے پرندوں کی مورت بنا کر اِس میں پھونک مارتے تو وہ سچ مچ کے پرندے بن کر اُڑ جاتے۔ تمام جمادات، نباتات اور حیوانات اِن کو پہچانتے، اِن کو سلام کرتے اور ان کے احکام کی تعمیل کرتے تھے۔ اِن کی اُنگلی کے اشارے سے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ اِن کے چہرے کے تاثر

قبلہ کا رخ بدل دیا گیا۔ انہیں زمین و آسمان، جنت و دوزخ اور کرسی و عرش کے عجائبات کی سیر
کرائی گئی اور مکالمہ اور قرب و دیدار سے مشرف فرمایا۔ زمین کے خزانوں کی چابیاں انہیں عطا کی
گئیں۔ ان کے لعاب دہن کی برکت اور شیرینی نے سوکھے چشموں کو جاری اور کھاری پانی کو میٹھا
کیا اور کھانے کی تھوڑی مقدار سے سینکڑوں آدمیوں کی سیری ہو گئی۔ لعاب دہن نے جب
شفائی کی تو سانپ کے زہر کا اثر زائل ہو گیا، آشوب چشم دور ہو گیا۔ تلواروں کے زخم بھر گئے اور
آنکھ سے باہر نکلا ہوا ڈھیلا پھر سے پیوست ہو کر پہلے سے بھی زیادہ روشن بصر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے
دشمنوں پر ان کی ہیبت طاری کر دی اور میدان جنگ میں ان کی مدد کیلئے گھڑ سوار فرشتے نازل کئے
گئے۔ ان کے قدموں میں بیٹھنے والے مساکین کو دنیا کی امامت و سیادت عطاء ہوئی اور ان کے
نامۂ مبارک کو پھاڑ دینے والے مغرور شہنشاہ کی سلطنت کے پرزے اڑا دیئے گئے۔ ان کی
مخالفت میں کھڑے ہونے والے تمام نمرود، فرعون، قارون، ہامان، ابوجہل اور ان کے بھائی بند
اپنی طاقت اور لاؤ لشکر کے باوجود اللہ کے شدید عذاب کی گرفت میں آ کر عبرت ناک انجام کو
پہنچے۔ ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کے تحریری حکم پر دریاؤں میں طغیانی آ جاتی ہے اور وہ
درندوں کو حکم دے کر جنگل خالی کرا لیتے ہیں۔ وہ ہزاروں میل دور لڑنے والے مجاہدین کو گھر بیٹھے
دیکھ لیتے اور وہیں سے ہدایات بھی جاری کر لیتے ہیں۔ المختصر یہ اسلامی روحانیت کی برکتوں اور
کرشمہ سازیوں کا ایک خاکہ ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں بٹھا لیں کہ اتنی عظیم روحانی طاقتوں کے
مالک اور اللہ تعالیٰ کے منتخب اور مقرب بندے کسی لحاظ سے بھی تارک دنیا ہرگز نہیں تھے۔ تقریباً
سب نے بھرپور دنیوی زندگی بسر کی، کام کاج کئے، شادیاں کیں اور صاحب اولاد ہوئے۔ ان
میں بھیڑ بکریاں چرانے والے، بڑھئی، کاشتکار، طبیب، کپڑا بننے والے، لوہے اور تانبے کی
صنعت کے ماہرین، تاجر، زمین کے خزانوں اور معاشیات کے ماہر، بڑے بڑے ہیکل اور محل
بنانے والے ماہر تعمیرات، پہاڑوں کی گھاٹیوں کو لوہے کی دیوار سے پاٹ دینے والے انجینئر اور
بڑے بڑے فاتحین اور حکمران بھی تھے۔ بلکہ بہت سے علوم اور صنعتوں کی ابتدا ان بزرگ ہستیوں
کے ساتھ ہی منسوب کی جاتی ہے۔ یہی حقیقی روحانیت کی راہ ہے اور اسی پر چل کر انسان اپنا مقصود
حیات حاصل کر سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ مومن کی فقیری کا رنگ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیر او مولا صفات
ہستی او بے جہات اندر جہات
او حریم و در طوافش کائنات

''تمہیں کچھ خبر ہے کہ مومن کا فقر کیا ہے۔ اِس کا ہدف تو ہر چیز کا مسخر کر لینا ہے۔ اس جدو جہد اور اللہ کے قرب کے نتیجے میں اِس میں اللہ کی صفات کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ مومن اگرچہ دنیائے رنگ و بو اور جہان شش جہات میں گھرا ہوا ہے لیکن اِس کی اپنی حقیقت اِن حدود سے ماوراء ہے۔ وہ خاک کا لباس پہنے ہوئے ضرور ہے لیکن خاک سے پیوستہ نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات مادی ہے لیکن مومن کی اصل عالم امر سے ہے۔ وہ مرکز کائنات ہے۔ تمام کائنات اس کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اِسی کے گرد طواف کر رہی ہے''۔

اِس دستور حیات کے تحت مرد مومن جدو جہد سے بھر پور زندگی بسر کرتا ہوا اللہ کے قرب و دیدار کی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ دنیا کی نعمتوں اور کاروبار کی گہما گہمیوں میں گھرا ہوا ہوتب بھی اِس کا دل اللہ کے ذکر سے غافل نہیں ہوتا۔ اِس کی راحت کا سامان اور قلب کا اطمینان نماز اور اللہ کا ذکر بن جاتا ہے۔ اِس لائحہ عمل کو آپ اسلامی روحانیت، اسلامی تصوف، سلوک و طریقت، احسان و حکمت یا اخلاص عمل میں سے جو چاہے نام دے لیں لیکن یہ انسانی جبلت اور فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ عالمگیر شریعت کی سچائی معلوم کرنے کی ایک پرکھ یہ ہوتی ہے کہ اگر اِس تعلیم کو پوری دنیا اپنا لے تو ہر طرف امن و امان اور ترقی و خوشحالی کا دور دورہ ہو جائے اور یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔ اب ذرا رہبانیت کی تعلیم کو اِس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں۔ خدانخواستہ اگر دنیا کے سارے انسان رہبانیت کو اپنا کر لنگوٹیاں پہن لیں اور آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں، پہاڑوں، مندروں اور خانقاہوں میں جا بسیں تو دنیا کا جو حال ہوگا اِسکا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ﷺ نے روحانی طاقت اور اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے طریقے تعلیم فرمائے ہیں وہ اِنتہائی سہل العمل اور سریع الاثر ہیں۔ اسلام کے تصوف میں نہ فاقے کرنا ہے نہ گوشہ نشینی ہے۔ نہ ہی دنیا کو ترک کر کے جنگلوں میں جانے کی اجازت ہے۔ راتوں کو جاگنا پڑتا ہے۔ نہ خانقاہوں میں بند ہو کر چلے کاٹنے پڑتے ہیں۔ اِس کے باوجود

طریقے اِس قدر موثر ہیں کہ اِن پرعمل کرنے سے برسوں کا راستہ مہینوں میں طے ہوتا ہے۔ اور وہ روحانی دولت حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسرے طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتی اِس فطری عمل میں روحانیت کے حصول کا اہم ترین ذریعہ نماز کی پابندی کے ساتھ ساتھ اللہ کا کثرت کے ساتھ ذکر کرنا ہے وہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، کھڑے لیٹے، اور کام کاج کے دوران ہر جگہ اور ہر وقت کیا جاتا ہے اِس ذکر کی اہمیت اور فضیلت پر قرآنی آیات اور حضور ﷺ کی احادیث شاہد ہیں۔ ذکر اللہ کا یہ طریقہ اِس قدر آسان ہے کہ اِس کے لئے مطلق وقت درکار نہیں ہوتا کیونکہ یہ ذکر سانس کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یعنی جو دم غافل سو دم کافر والے اصول پر عمل کیا جاتا ہے۔ بقول شاعر

مرد بن، غافل نہ ہو، ذکر خدا سے پیار رکھ
ہاتھ پاؤں کام میں اور دل کو سوئے یار رکھ

اِس ذکر کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جو سانس اندر جائے اِس کے ساتھ بھی اللہ اور جو سانس باہر آئے اِس کے ساتھ بھی لفظ اللہ اس طرح کہا جاتا ہے کہ دل کہے اور کان سنیں۔ اِس راہ پر چلنے کے لئے جو دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں وہ ہیں استعداد اور استاد۔ یعنی انسان کے دل میں حصول مراد کیلئے طلب صادق موجود ہو اور اِس کے ساتھ مرشد کامل میسر آ جائے۔ یہ دونوں باتیں حاصل ہو جائیں تو اللہ کے فضل و کرم سے منزل نزدیک اور آسان ہو جاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا دین کامل ہو چکا ہے اور کوئی نعمت ایسی نہیں جو اِس میں شامل نہ ہو تو پھر روحانی قوت اور فقیری کے حصول کے لئے اسوہ رسول مقبول ﷺ کے علاوہ اور شریعت سے باہر کسی دوسرے طریقے کی ضرورت محسوس کرنا دین کی کاملیت سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ اسلام کے تصوف میں ایک سالک دنیا کے سارے کام احسن طریقے سے انجام دیتے ہوئے اور تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے قرب و دیدار کی نعمت سے مشرف ہو سکتا ہے۔ اس تصوف کے ترویج کیلئے اِس صدی کے عظیم صوفی اور روحانی علوم کے محقق بزرگ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے سلسلہ عالیہ توحیدیہ قائم فرمایا۔

جو قارئین روحانیت کے متلاشی اور قرآن و سنت کی تعلیم کے مطابق سلوک طے کرنے کے خواہاں ہوں اِن کے لئے بانی سلسلہ توحیدیہؒ کی تصانیف کا مطالعہ انشاء اللہ بیش بہا معلومات کا ذریعہ اور سعادت و برکت کے حصول کا باعث ثابت ہوگا۔

خواجہؒ کے خطوط

(ترتیب وتدوین۔ خالد مسعود)

1۔ خادم حلقہ ملازم کی طرح ہے

(بنام عاشق حسنین شاہ بخاری صاحب 1966-6-6)

''میں نے تو اللہ میاں سے پوچھا تھا کہ کس کو خادم حلقہ بنانا چاہئے تو مجھے القاء ہوا کہ عابد کو بنا دو چنانچہ میں نے بنا دیا۔ خادم حلقہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ روحانیت میں اپنے سب پیر بھائیوں سے بڑے ہیں آپ سے کہیں بڑے بڑے روحانی طاقت والے کراچی کے حلقہ میں بہت ہیں۔ اِس سے پہلے جو مومن صاحب خادم حلقہ تھے اِن میں ہی کونسی روحانیت تھی۔ مومن صاحب تو بیچارے رہے ایک طرف خود ملک بخشیش الٰہی میں بھی کوئی خاص روحانیت نہ تھی۔ البتہ اِن کا اخلاق بہت اچھا تھا اور ان کی توجہ خوب تھی۔ شاید یہ لوگ توجہ کو ہی روحانیت سمجھتے ہیں۔ جو ایسا خیال کرتا ہے وہ فقیری اور روحانیت کی الف بے تے بھی نہیں جانتا۔ بھلا روحانی طاقت والوں کو میں خادم حلقہ جیسی گھٹیا اور تھرڈ کلاس خدمت کیلئے کیسے مقرر کر سکتا ہوں۔ ان کے لئے تو بہت اُونچے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں اور کوئی ان کو جانتا بھی نہیں۔ نہ کوئی روحانی بزرگ یہ خواہش رکھتا ہے کہ لوگ اِس کو جانئیں اور اِس کی عزت کریں۔ وہ تو صرف خدا کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ دنیا کچھ ہی کہے، کچھ ہی کرے۔ بہر حال یہ تو میں ایسے ہی جوش میں لکھ گیا۔ مطلب یہی تھا کہ بعض لوگ جو خادم حلقہ بننا چاہتے ہیں وہ اول درجہ کے دنیا دار ہیں روحانیت سے اِن کا کیا سروکار۔ اللہ اِن سب کو ہدایت دے۔ خادم حلقہ تو ایک ملازم کی طرح ہے جو حلقہ کرا دیتا ہے اور اگر ہو سکے تو آنیوالوں کی چائے پانی سے کچھ خدمت کر دیتا ہے۔ اللہ اِن سب کو ہدایت دے اور بے لوث ہو کر خلوص سے سلوک پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین''۔

2۔ یہاں تو دل چاہیے

(بنام عاشق حسین شاہ بخاری صاحب 1967-5-3)

''محبت کی راہ میں دور اور قریب کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں تو ''دل'' چاہئے۔ فائدہ تو

ل کرنے پر منحصر ہے۔بیسیوں آدمی پاس رہ کر بھی کورے رہ گئے اور بیسیوں دور رہ کر بھی بن
ے۔ بات تو عمل کی ہے۔ امتحان کے زمانہ میں ضروری نہیں کہ حلقوں میں شریک ہوں۔ محنت
یں حلقے بعد میں ہو جائیں گے۔ اِس سال کا خطبہ محض آپ کی اس رپورٹ پر لکھا گیا تھا جو
پنے بریلوی خیالات کے لوگوں کے متعلق دی تھی۔ اب اِن لوگوں کا کیا حال ہے اور کیا خیال
ایسی باتوں کی خبر دیتے رہا کریں یہ بڑا اہم کام ہے میں اِس سے بہت خوش ہوتا ہوں''۔

3۔ بلند حوصلہ لوگ

(بنام عاشق حسنین شاہ بخاری صاحب 20-5-1966)

''خط ملا۔ حالات معلوم ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ضرور اچھی سی ملازمت دے دیگا۔ آپ
ے حوصلہ کے آدمی ہیں کہ ملازمت کرتے ہوئے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ شاباش۔ ایسے بلند
لوگوں کی اللہ ضرور مدد کرتا ہے۔ آپ مجھے اِن لوگوں کے نام لکھیں جو عابد صاحب کے حلقہ
دانستہ شریک نہیں ہوتے۔ اب حلقہ میں جاؤ تو عابد صاحب سے کہنا کامٹی کا خیرات فنڈ ابھی
ہیں آیا۔ حالانکہ اُنہوں نے لکھا تھا کہ ہر ماہ کی دس تاریخ تک بھیج دیا کریں گے''۔

4۔ ایسا کوئی آدمی اللہ پیدا کردے

(بنام محمد قاسم صاحب 4-2-1962)

''سب سے پہلے تو تحقیق (Research) اِس بات پر کی جائے کہ مذہب اسلام موجودہ
رقیات کے ساتھ چل بھی سکتا ہے یا نہیں اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ اِس قسم کی
ج نہ تو مغربی تعلیم یافتہ ڈاکٹر وغیرہ ہی کرسکتے ہیں اور نہ ہی فقہی علماء۔ اِس کے لئے تو ایسا
ہونا چاہئے جو موجودہ علوم میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہو اور تفسیر، حدیث اور فقہ میں بھی۔ اور دونوں
وہ روحانیت میں بھی محقق کا درجہ اِس کو حاصل ہو۔ خدا کرے ایسا کوئی آدمی اللہ پیدا کر
ر اُمت مسلمہ اِس کی مان لے تو انشاء اللہ مسلمانوں کی یقیناً ترقی ہوسکتی ہے''۔

توحید اللہ والوں کی نظر میں

(ترتیب وتدوین۔ حافظ محمد یٰسین توحیدی)

''توحید اللہ والوں کی نظر میں'' کے عنوان کے تحت زیرِ نظر مضمون ہمارے محترم بھائی جناب خالد مسعود صاحب آف اسلام آباد نے سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماع پر پڑھا۔

یہ مضمون دراصل حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے خطبہ کا اُردو میں ترجمہ ہے۔ جو حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے کیا ہے۔ جو قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔

صاحبو!

دوڑو اللہ تعالیٰ کی طرف اور مخلوق اور دنیا اور جملہ ماسوا اللہ سے بھاگو! خدا کی طرف چلو اس کی جانب اپنے دِلوں سے۔ کیا تم نے ارشادِ خداوندی سنا نہیں۔ کہ آگاہ ہو جاؤ۔ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ پس اگر تم وہاں پہنچ گئے تو سب کچھ تمہیں وہیں مل جائے گا۔

''صاحبزادہ''

مخلوق کی طرف بقاء کی آنکھ سے مت دیکھ۔ بلکہ فنا کی آنکھ سے دیکھ۔ اِن کو نفع نقصان کی نگاہ سے نہ دیکھ بلکہ عجز و ذلت کی نگاہ سے دیکھ (کہ سب کو ناپید و عاجز سمجھے) حق تعالیٰ کو یگانہ سمجھ اور اِسی پر بھروسہ رکھ۔ اور جس شے سے فراغت ہو چکی ہے۔ اِس میں مت بول۔ دنیا ے اور جو کچھ اِس میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سب سے فراغت ہو چکی ہے اور مخلوق سے اور جو اِن ے انقلاب پیش آ رہے ہیں۔ سب سے فراغت ہو چکی ہے۔ مومن کا قلب اِن سب سے فارغ ر ہے۔ خصوصاً جبکہ اسباب سے معرا (اور متوکلانہ گذران کر ہو رہا ہو) تب تو (فارغ البال ہو کی) حالت بہت ہی مستحکم ہوتی ہے۔ اور اگر اسباب اور اہل و عیال اِس کو حاصل ہوتے ہیں اِن پر اعانت کی جاتی اور اِن کے تحمل کی قوت اِسکو دیدی جاتی ہے۔ پس اِسکا دل بہر حال پروردگار کے سوا سب سے فارغ رہتا ہے۔ کہ ہر وقت و ہر لحظہ اپنی فنائیت میں مستغرق ہے۔ اِس میں تبدل و تغیر کا طالب نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو حکم صادر ہو چکا ہے۔ وہ بد گا نہیں۔ اور مقسوم جس سے فراغت ہو چکی ہے نہ کم ہو گا نہ زیادہ۔ پس نہ وہ کمی بیشی کا خواہاں ہے اور نہ اپنے مقسوم کی تاخیر و تعجیل کا کیونکہ اِس کو محقق ہو چکا ہے۔ کہ مخلوق کے لئے ایک و

معین مقدر ہے۔ پس مخلوق میں یہی اور اِس جیسے لوگ ہی درحقیقت عقلاء ہیں اور کمی بیشی یا تعجیل و تاخیر کے طالب درحقیقت دیوانے ہیں۔ جو شخص اللہ سے راضی ہوگا۔ اس کو اس کی اور دوسرے کی ہر حالت میں حق تعالیٰ اپنا موافق بنائے رکھے گا۔ اِس کو اپنی محبت و معرفت بخشے گا۔ اور ساری عمر اِس کو اپنی براہ مقصود پر ساتھ رکھے گا۔ اول موافق بنائے گا اُس کے بعد مقرب کرے گا اور اس کے حیران و پریشان ہونے کے وقت فرمائے گا کہ میں تو تیرا پروردگار موجود ہوں۔ (پھر غم کاہے کا کرتا ہے) جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ "میں ہی تو تمہارا رب ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام سے تو ظاہراً فرمایا تھا۔ اور اِس عارف کے قلب سے باطناً فرمائے گا۔ کہ اِسکو بحرمتہ پیغمبر ﷺ اور اپنی رحمت و شفقت کے سبب سنا بھی دے گا۔ (تا کہ اِسکا دل ٹھہر جائے) انبیاء علیہم السلام کے معجزے تو ظاہر ہوتے ہیں۔ اور اولیاء کی کرامتیں باطنی۔ وہ انبیاء کے وارث ہیں۔ کہ دین خداوندی قائم رکھتے اور اِس کو انسان و جن ہر دو قسم کے شیطانوں سے بچاتے رہتے ہیں۔ تو اللہ اور اِسکے رسولوں اور اِن اولیاء سے ناواقف ہیں۔ اے منافق! تو کیا جانے کہ اللہ والے کس مزے میں ہیں۔ تو قرآن پڑھتا ہے اور نہیں جانتا ہے کہ کیا پڑھ رہا ہے؟ عمل کرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ کیا کر رہا ہے (یہ بے خبری کے اعمال) دنیا ہی ہیں۔ بلا آخرت کے۔ اور باوجود اِس کے تو اللہ والوں پر اعتراض کرتا ہے۔ عقلمند بن اور ادب سیکھ اور توبہ کر اور زبان بند کر۔ نہ تجھے اللہ تعالیٰ کی خبر ہے۔ نہ اِسکے رسولوں کی خبر ہے۔ نہ اِسکے اولیاء کی خبر اور نہ اِسکے علم کی خبر جو تیرے اور مخلوق کے متعلق اِسکو حاصل ہے۔ (اور جسکو تقدیر و سابقہ کہتے ہیں) توبہ اور سکوت لازم پکڑ اور اپنے مرنے اور قبر کی طرف کاندھوں پر سوار ہو کر جانے کی سوچ تا کہ تجھ کو علم حاصل ہو" اللہ کے ساتھ معاملہ رکھ کہ وہ تجھ کو ایک نور عطا فرمائے۔ جس کی روشنی تجھ کو دنیا و آخرت میں حاصل رہے۔ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اس کو مانو۔ اور اِس پر عمل کرنے میں سعی کرو اور تقدیر کے ساتھ لٹکا رہنا (کہ جیسا کی انجام ہونا مقدر ہے عمل کئے بغیر) چھوڑ دو کہ یہ محض ہوس اور کمزوری اور کاہلوں کی حجت ہے ہم کو تقدیر سے کیا بحث (وہ تو خدا کی لکھت ہے اور اِسکا واسطہ اِسی میں ہے) ہم کو تو یہ چاہیے کہ کمر باندھیں اور کوشش کریں اور کام میں لگیں نہ قال و قیل اور چون و چرا کریں۔ اور نہ علم خداوندی میں بحث کریں۔

ہمارا کام کوشش کرنا ہے۔ باقی وہ مختار ہے جو چاہے کرے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو کچھ وہ کرے اسکی باز پرس اس سے نہ ہوگی اور بندوں سے باز پرس ہونی ہے۔
جب تیرا کام ہو جائے گا اور حق تعالیٰ تیرے قلب کو اپنا مقرب بنا لے گا۔ تب وہ تجھ کو دنیا میں بے رغبت اور آخرت میں بارغبت بنا دے گا اور تو اپنا نام قرب پروردگار کے دروازہ پر لکھا ہوا پائے گا۔ کہ فلاں بن فلاں اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ بندوں میں سے ہے"۔ پس یہ (وہ لکھت) ہے جس میں نہ تغیر و تبدل ہوتا ہے اور نہ کمی بیشی۔ پس اِس وقت اپنے پروردگار کیلئے تیرا شکر اور اسکے سامنے طاعات اور نیک کاموں کا کرنا تیرا بڑھ جائے گا اور باوجود اِسکے اپنے قلب کے ہاتھ سے خوف کو مت چھوڑ اور اِسکی قدرت کو کمزور نہ سمجھ۔ (کیونکہ اگر اُلٹے پاؤں لوٹا کر ملعون بنا دے تو کون ہے کہ اِس کا ہاتھ روک لے) اور اِسکا ارشاد پڑھ کر اللہ مٹا دیتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور قائم رکھتا ہے۔ اور جو کچھ چاہتا ہے۔ اور اسی کے پاس اسکی اصل لکھت ہے۔ نیز اِسکا یہ ارشاد کہ جو کچھ وہ کرے اسکی اِس سے پوچھ نہ ہوگی اور بندوں سے پوچھ ضرور ہوگی"۔
تو اِس لکھت پر مطمئن مت ہو کیونکہ جس نے اِسکو لکھا ہے وہ اِسکے مٹانے پر بھی قادر ہے۔ بروقت طاعت و خوف اور خشیہ و احتیاط کے قدم پر رہ یہاں تک کہ موت آ جائے اور سلامتی کے پاؤں پر دنیائے آخرت کی طرف عبور کر جائے۔ پس اِس وقت تو تغیر و تبدل سے بے خوف ہو جائے گا۔

اے وہ شخص!

جو دنیا اور دنیا کی کشمکش میں اپنے جہل و نفاق اور طلب سے گھسا جا رہا ہے۔ اور اے حرام خور تو قلبی نور اور باطنی صفائی اور دانشمندانہ تکلم کی طمع کس طرح کرتا ہے؟ اللہ والوں کا کلام تو بضرورت اور اُنکی نیند تو استغراقی اور کھانا بیماروں کا سا (بادل ناخواستہ) ہوا کرتا ہے۔ پس وہ اِسی حالت پر رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ لکھت اپنی انتہا کو پہنچے اور موت کا وقت آ جائے) وہ فرشتوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جن کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ " وہی کام کرتے ہیں جنکا اُنکو حکم کیا جاتا ہے" وہ ان کے مشابہ بن جاتے بلکہ اُن سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ پس فرشتے اُن کے خادم ہوتے ہیں۔ کہ دنیا و آخرت میں اُن کے حاشیہ بردار بنتے ہیں۔

ملفوظات بانی سلسلہؒ

(ابن طاہر توحیدی)

(1) عرفان ذات باری تعالیٰ تک پہنچنے کے صرف دو راستے ہیں ایک راستہ عشق کا ہے جو ب کہلاتا ہے دوسرا عبادت وتقوی کا ہے۔ جس کو سلوک کہتے ہیں۔

(2) میں آپ کو صحوی تصوف سکھانا اور انسان کامل بنانا چاہتا ہوں۔

(3) میں جس راستہ پر آپ کو چلانا چاہتا ہوں وہ بالکل ہمارے سرکار ابد قرار احمد مجتبیٰ ﷺ نقش قدم پر جاتا ہے۔

(4) میں آپ کو فقر محمدیؐ سکھانا چاہتا ہوں۔

(5) مخلوق سے محبت کرو کیونکہ وہ تمہارے خالق کی نشانی ہے۔

(6) آپکو رجائی (آپٹومسٹ) بننا چاہیے یعنی ہر حالت میں خوش اور پرامید رہنا چاہیے۔

(7) جب تک قوت برداشت پیدا نہ ہو جائے اصلاح کیلئے قدم نہیں بڑھانا چاہیے۔

(8) قوت برداشت صرف انہی لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جو غصہ کو نفی کر دیتے ہیں۔

(9) وقت اور وعدے کی پابندی کردار انسانی کی عمارت میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے

(10) میں تم سب کو بیدار بلکہ زندہ صوفی بنانا چاہتا ہوں۔

(11) ہمیشہ خوش رہا کرو۔ دل میں خدا کو بسائے رکھو۔ ہاتھ پاؤں کو خدمت خلق میں ٔ رکھو۔

(12) مرتے دم تک کام کرتے رہو اور خدا کی یاد میں مر جاؤ۔

(13) خلق خدا کی محبت اور خدمت کے جذبہ کو اور ترقی دیں۔ ہمیشہ حق پر چلنے کی کوشش کریں۔

(14) تصوف کا موضوع و مقصد ہے اللہ کی معرفت حاصل کرنا۔

(15) ہر سانس سے جو باہر نکلے یا اندر آئے لفظ اللہ دل میں کہا جائے آواز نکلے بغیر۔

(16) ہر وہ شے جو خدا کی یاد سے غافل کر دے راہ سلوک کی رکاوٹ ہے۔

(17) نماز پنج وقتہ جماعت کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔

(18) نماز ایسی ہو کہ نیت باندھنے سے سلام پھیرنے تک برابر اللہ تعالیٰ ہی یاد رہے۔

(19) یادِ خدا کے اِنتہائی مدارج یہ ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی موجودگی کا احساس ہونے لگتا ہے، اِس کو حضوری کہتے ہیں۔

(20) دنیا کی تمام چیزوں سے دلی تعلق توڑ کر صرف اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑ لیا جائے اسی کو قطع ماسوائی اللہ کہتے ہیں۔

(21) جو واقعات تم کو اپنی مرضی کے خلاف پیش آئیں ان کو منجانب اللہ سمجھو اور ان پر صرف صبر ہی نہ کرو بلکہ خوشی سے برداشت کرو۔ اسی کو تسلیم و رضا کہتے ہیں۔

(22) صبر کے معنی اِنتہائی قوت برداشت سے کام لینے کے ہیں۔

(23) توکل یہ ہے کہ کتنا ہی مشکل اور ناممکن کام ہو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس پر عمل شروع کر دو۔

(24) نفرت کا جذبہ تصفیہ قلب میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

قرآن اور تمثیلات

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی)

کسی کو بات سمجھانے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ایک ہے عقلی استدلال ۔دوسرے
باتی اپیل۔تیسرے روحانی تاثیر۔چوتھے تشبیہہ وتمثیل اور پانچویں مادی طاقت کا استعمال۔
ب ہم اقلیدس کی شکل اثباتی کسی کو سمجھاتے ہیں تو وہاں صرف عقلی استدلال سے کام لیتے ہیں۔
ں نہ جذبات کو ابھارتے ہیں۔نہ روحانی زور لگاتے ہیں،نہ مثالیں دیتے ہیں،نہ مادی طاقت
رکت میں لاتے ہیں۔اسی طرح اولاد کی محبت کا فلسفہ سمجھانے کے لیے صرف جذبات کو چھیڑ
کافی ہوتا ہے۔وہاں نہ عقلی استدلال کا کام ہے نہ روحانی تاثیر کا،نہ تشبیہات کا اور نہ طاقت
۔یونہی بعض اوقات صرف روحانی تاثیر وہ کام کر جاتی ہے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں
ضرت ابوہریرہؓ اپنی والدہ کی زبانی شان رسالتؐ میں گستاخانہ کلمات سن کر روتے ہوئے آتے
۔حضورؐ صرف اتنا فرماتے ہیں۔''اللھم اھد ام ابی ھریرہ ''ابوہریرہؓ جب بادل
خواستہ گھر واپس آتے ہیں تو والدہ کلمۂ شہادت ادا کر رہی ہوتی ہیں۔یہاں نہ عقل وفلسفہ تھا نہ
لات،نہ جذباتی اپیل،اور نہ مادی طاقت کا استعمال۔

اس وقت ان تمام طریقوں سے بحث کرنا مقصود نہیں۔یہاں صرف ایک ہی چیز پر گفتگو کرنی
اور وہ ہے تشبیہات وتمثیلات سے سمجھانا۔یوں تو تمام طریقہائے تفہیم اپنی اپنی جگہ کارگر اور سود
ں اور کافی بھی ہیں۔لیکن تمثیلاتی طریقہ اپنے اندر ایک عجیب تاثیر رکھتا ہے۔اس سے تین
ے ہوتے ہیں۔

تمثیل کے فوائد

۱۔اگر کوئی اور طریقہ پوری طرح کارگر نہ ہو تو صرف تشبیہات وتمثیلات سے بات پوری
سمجھ میں آجاتی ہے۔

۲۔اگر دوسرے طریقوں سے سمجھانے کے بعد بات سمجھ میں آگئی ہو۔لیکن پوری طرح دماغ اُسے گرفت نہ کر سکا ہو یا ابھی کچھ شکوک وشبہات باقی رہ گئے ہوں اور پوری تسکین نہ ہوئی ہو تو تمثیلات سے یہ خلا پر ہو جاتا ہے۔اور تشبیہات اس کسر کو پورا کر دیتی ہیں۔

۳۔اگر بات پوری طرح سمجھ میں آگئی ہو تو تمثیلات سے مزید وضاحت اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔اور بات دل کی گہرائیوں تک اُتر جاتی ہے۔

غرض تمثیلات کسی حالت حالت میں بے فائدہ نہیں ہوتیں۔یہ صحیح ہے کہ منطقی حیثیت سے مثال لنگڑی ہوتی ہے اور چار پاؤں سے نہیں چلا کرتی اور بقول عارف رومی پائے استدلال چوبیں اور بے تمکیں ہوتا ہے لیکن تشبیہہ اپنی تاثیر کے لحاظ سے بعض اوقات تمام طریقہائے تفہیم کو پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ بلا شبہ تشبیہہ تمثیل کا وہ درجہ نہیں جو منطقی استدلال کا ہوتا ہے لیکن تفہیم کا مقصد عموماً اس کے بغیر تشنہ رہ جاتا ہے۔

تمثیل سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات عقلی و منطقی استدلال سے بڑی دیر میں یا بڑی مشکلوں سے سمجھ میں آتی ہے۔وہ تمثیل کے ذریعے بہت جلد اور آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ بے شمار انسان دنیا میں ایسے ہیں جن کے دماغوں کی ساخت دوسرے طریقہائے تفہیم کو جلدی قبول نہیں کرتی مگر مثالوں کو فوراً قبول کر لیتی ہے۔

تمثیل کی ضرورت

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر پیغمبر، ہر حکیم، ہر عاقل، ہر دانا، ہر خطیب، ہر مصنف اور ہر معلم کو تشبیہات اور تمثیلات سے بھی کام لینا پڑا ہے۔انہوں نے صرف عقلی استدلال پر اکتفا نہیں کیا۔صرف جذبات کو ابھار کر نہیں چھوڑ دیا۔محض طاقت کو حرکت میں لا کر الگ نہیں ہو گئے۔محض روحانی تاثیرات پر قناعت نہیں کی۔وہ ہر ایک طریقے کو کام میں لاتے رہے۔مگر تمثیلات و تشبیہات سے کسی کو مفر نہ ہو سکا۔اُنہوں نے یہ تمام طریقہائے تفہیم اس لیے اختیار کیے کہ

...ماغ جس طریقے سے مناسبت رکھتا ہوگا وہ اُسی راستے سے آئے گا۔اور یہ تمثیلات اس کو اسی راستے سے ہدایت کی منزل تک آنے میں مدد دیں گی۔

انبیاء علیہم السلام میں سیدنا مسیح ؑ تمثیلات کے بادشاہ ہیں اور ایسی ایسی تمثیلیں دیتے ہیں کہ بڑے سے بڑا عقلی استدلال بھی وہاں پھیکا معلوم ہوتا ہے۔حکماء و صوفیاء میں عقلی استدلال کے ساتھ تشبیہات کا امام شاید رومی سے بڑھ کر کوئی نہیں۔

ان سب سے قطع نظر کر کے اگر آپ قرآن پاک اور احادیث نبوی پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو بے شمار ایسی تمثیلات و تشبیہات ملیں گی جن سے زیادہ چسپاں کوئی مثال، اور جن سے زیادہ موثر کوئی اور چیز نہیں مل سکتی۔پورے قرآن اور تمام احادیث کی ساری مثالوں کو پیش کرنا مقصود نہیں اور نہ یہاں اس کا موقع ہے۔ہم دونوں میں سے ہر ایک کی تھوڑی امثلہ یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، جن سے الٰہی تمثیلات اور نبوی تشبیہات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔اور پھر اس سے یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ ہر صاحب علم نے تشبیہات کے ذریعے کیوں بہت سے مسائل سمجھائے اور سلجھائے ہیں۔

قرآنی نظریۂ تمثیل

قرآن کے پیش نظر صرف مقاصد تمثیلات ہی نہیں بلکہ دو ضروری اجزائے تمثیلات بھی ہیں۔اس لیے قرآنی تمثیلات سننے سے پہلے یہ دونوں باتیں بھی سُن لینی چاہئیں۔اول تو قرآن کا نظریۂ تمثیل ہے جس میں وہ بیان فرماتا ہے:۔

ان اللّٰہ لا یستحیٖ ان یضرب مثلًا ما بعوضۃ فما فوقھا فاما الذین اٰمنوا فیعلمون انہ الحق من ربھم واما الذین کفروا فیقولون ماذا اراد اللّٰہ بھٰذا مثلًا۔۔۔۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ کو مچھر یا اس سے بھی "کمتر" چیز کی مثال پیش کرنے میں کوئی حجاب نہیں آتا۔ایمان والے لوگ تو ایسی مثال سن کر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔لیکن اہل کفر

یہ کہتے ہیں کہ اس سے خدا تعالیٰ کا مقصود کیا ہے؟------

یہاں یہ چیز نوٹ کر لیجیے کہ قرآن میں کہیں بھی مچھر کی کوئی تمثیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ مکھی مکس شہد اور لکڑی کا تو ذکر ہے لیکن مچھر کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ لیکن انہی چیزوں کے ذکر پر اہل کفر یہ طنز کرتے تھے کہ یہ خدا کا کلام ہے جس میں مکھی مچھر کا ذکر ہوتا ہے؟ اسی کا جواب یوں دیا گیا ہے کہ مچھر تو الگ رہا اگر اس سے بھی کوئی حقیر چیز ہو تو مثال میں اُسے پیش کرنے سے اللہ کو کوئی شرم نہیں آتی۔ مطلب یہ ہے کہ مثال میں گھٹیا سے گھٹیا چیز بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ دیکھنے کی چیز ''ممثل لہٗ'' (جس چیز سے تشبیہ دی جائے) نہیں بلکہ ''وجہ تشبیہ'' کو دیکھنا چاہیے کہ وہ پوری طرح چسپاں ہوتی ہے یا نہیں۔

تمثیل کے اجزائے سہ گانہ

تمثیل کے تین ضروری اجزا ہوتے ہیں۔ مثال (ممثّل) ممثل لہٗ۔ اور وجہ تمثیل۔ مثلاً چاند جیسا چہرہ اس میں ''چہرہ'' مثال ہے۔ ''چاند'' ممثل لہٗ اور ''حسن و جمال'' وجہ تمثیل۔ مثال میں ایک اور چیز کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خوبی ہو یا زشتی ممثل لہٗ کو مثال سے برتر ہونا چاہیے۔ خوبی کا ذکر ہو تو خوبی میں اور زشتی کی تمثیل ہو تو زشتی میں۔ لیکن اگر ایسا ممثل لہٗ موجود ہی نہ ہو جو وجہ تمثیل میں مثال سے برتر ہو تو مساوی یا کم تر ممثل لہٗ سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں دونوں نظیریں موجود ہیں۔

تمثیلات کے قرآنی مقاصد

ایک اور ضروری چیز بھی اس سلسلے میں ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ قرآن پاک نے امثلہ کے کئی مقاصد بتلائے ہیں مثلاً:

۱۔ ایمان کا امتحان جیسا کہ مذکورہ بالا آیت (**ان اللّٰہ لا یستحی----الخ**) میں مذکور ہے کہ اہل ایمان سن کر اسے من جانب اللہ حق تسلیم کر لیتے ہیں اور اہل کفر مذاق

...اتے ہیں۔

۲۔تذکر جس کے معنی یاد کرنا جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

ولقد ضربنا فی ھذا القرآن من کل مثل لعلھم یتذکرون۔

ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثالیں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں کو تذکر ہو۔

ایک بھولی بسری بات دفعتہً یاد آجائے تو اسے تذکر کہتے ہیں۔ بعض مسائل کا بھی یہی حال ...ا ہے کہ وہ یوں دوسرے طریقوں سے سمجھ میں نہیں آتے۔ لیکن مثال سے ان کو واضح کر دیا ...ئے تو اس طرح سمجھ میں آجاتے ہیں جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آجائے۔

۳۔تفکر یعنی غور و فکر۔ قرآن میں ہے:

وتلک الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون۔

ہم یہ مثالیں لوگوں کے لیے اس واسطے بیان کرتے ہیں کہ وہ تفکر کریں۔

بسا اوقات ایک اعلیٰ سے اعلیٰ بات پر انسان دھیان نہیں دیتا لیکن اگر اسی کو مثال سے واضح ...یا جائے تو خواہ وہ اس وقت اسے تسلیم نہ کرے مگر مثال کی بدولت وہ بات اس کے لیے قابل ...فکر ہو جاتی ہے۔ سب کا خلاصہ یہی ہے کہ تمثیل و تشبیہ سے بات واضح ہو کر دل میں اتر جاتی ...۔اور جو چیز دوسرے طریقہائے تفہیم سے دیر میں اور بدقت سمجھ میں آتی ہے وہ تمثیل و تشبیہ ...بلد سمجھ میں آجاتی ہے۔ (جاری ہے)

قرآنی تصور مملکت

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہو سکا تھا۔ اور یہ ایک انوکھا اور عجیب وغریب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے حضرت محمد صلعم کو متحدہ طور سے اپنا روحانی اور سیاسی سردار تسلیم کرلیا۔ جس ملک میں نراج کا دور دورہ ہو۔ وہاں دس ہی سال کی کوشش میں ایک مرکزیت اور نظام قائم کردینا رسول کریم صلعم کا عظیم الشان کارنامہ تھا۔ آنحضرت ﷺ اپنے آپ کو آسمانی وحی کا تابع قرار دیتے تھے، جو وقتاً فوقتاً آتی تھی اور جس کا مجموعہ اب قرآن کے نام سے دنیا میں موجود و مشہور ہے۔ اگر کوئی شخص سیرت نبویہ کا قریب سے مطالعہ کرے، تو اُسے ام المومنین حضرت عائشہؓ کے اِس قول کی صحت کو باور کرنے میں ذرا بھی دشواری نہ ہوگی کہ قرآن رسول کریم ﷺ کی زندگی کا آئینہ ہے، (کان خلقه القرآن)۔ اسی لئے یہ معلوم کرنا کہ آنحضرت ﷺ کی شریعت میں مملکت کا تصور کیا ہے، بڑی آسانی کے ساتھ قرآن کو دیکھنے سے ممکن ہے۔ (حدیث کے امور سے استفادہ طویل تر فرصت اور کثیر تر مطالعے کا متقاضی ہے)

یہ چیز قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں نہ صرف ازمنہ سابقہ کے پیغمبروں کے حالات بیان ہوئے ہیں، بلکہ اُن کی سیرتوں کو جو قرآن میں ہیں اب بھی ماخذِ قانون تسلیم کیا گیا ہے، بجز اس کے کہ صراحت سے قرآن اُسے یا اُس کے کسی جز کو منسوخ قرار دے۔ دوسرے الفاظ میں انبیائے سابقہ کی سنت مسلمانوں پر اب بھی واجب التعمیل ہے، بجز اِس کے کہ اس کے کسی معین جز کے نسخ کا کوئی حکم قرآن مجید میں یا رسول اللہ ﷺ کے افعال واقوال میں صراحت سے ملتا ہو۔

ایک آیت ملاحظہ ہو:۔

اولئك الذين اتينهم الكتب والحكم والنبوة۔

''یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطاء کی۔ اگر کوئی لوگ اِس کو نہ مانیں تو ہم یہ امانت ایسے لوگوں کے سپرد کریں گے۔ جو اِس سے انکار نہ کریں یہی وہ لوگ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے، اِس لئے تو اِن کی رہنمائی کی پیروی کر۔ (قرآن ۸۹تا۹۰)

امام بخاری اور ترمذی نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ جب کبھی کسی معاملے میں براہ راست آسمانی وحی نہیں آتی، تو رسول کریم ﷺ بجائے عام عربی رواجات کے اہل کتاب کے

طریقوں کی پیروی فرمایا کرتے تھے۔

یہ چیز سیاسی معاملات کی حد تک بھی اسی طرح صادق آ سکتی ہے، جس حد تک معاشی و معاشرتی معاملات ہیں۔

معاشرہ انسانی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ''مملکت'' کا قیام بڑے عرصے کے بعد ہو سکا۔ قرآن مجید میں واقعات کی جو ترتیب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدمؑ پیدا ہوئے، جن کو خدا نے زمین پر نائب یا خلیفہ مقرر کیا۔ وہ نسل انسانی کے باپ تھے اور بزرگ خاندان ہونے میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد کئی نسلوں تک اِن کی اولاد میں مختلف قسم کے اختلافات اور برائیاں کم یا زیادہ مقدار میں جاری ساری رہیں، اسی لئے قرآن مجید کے مطابق پیغمبر بھیجے گئے، جو خدا اور عام انسانوں کے مابین واسطے کا کام دیتے تھے۔ وہ انسانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ان کے خالق کی مشیت اور اس کا حکم کیا ہے اور نیکی کی ترغیب دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔ اِن پیغمبروں نے خلوص کے ساتھ جو بے غرضانہ نصیحتیں کیں، اور اُن کی باتوں کو کچھ لوگوں نے مانا بھی تو اِس جماعت کی حیثیت کسی مملکت کی قرار دینی مشکل ہے۔ بظاہر قدیم ترین زمانے میں انبیاء علیہم السلام کی آمد کے باوجود سیاسی نظام اور اقتدار کی ضرورت نہیں پائی جاتی تھی۔ قرآن مجید میں بھی بار ہا ذکر ہے کہ ایک قوم کی جگہ دوسری قوم کو سرفرازی عطا ہوئی۔ مگر ایک مملکت کو دوسری مملکت کی جگہ قائم کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ان قومی وحدتوں کے غیر سیاسی وجود کے باوجود اِن لوگوں کی معاشی و سماجی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر صرف اِس طور سے ہوا ہے کہ لوگ ان خدا کی نعمتیں سمجھ کر یاد رکھیں اور خدا کی اطاعت کا فریضہ بجالائیں۔

بادشاہی کے ذکر کا آغاز قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے ملنے لگتا ہے، جب کہ ایک شخص اپنے ملک کے تمام لوگوں کی جان و مال پر اپنا اقتدار چلاتا ہوا نظر آتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے زمانے سے مملکت میں زیادہ ترقی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُن کے زمانے کے حالات میں (دیکھئے قرآن مجید ۳۰، ۱۳) بادشاہوں اور وزیروں اور سرکاری قید خانوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ (سورہ یوسف)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو حالات قرآن مجید میں ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی

اسرائیل کے اِن مقدس رہنما کی تمنا اور خواہش یہ تھی کہ ارضِ موعود میں ایک مملکت قائم کریں۔مگر قوم نے اپنی نااہلی کے مظاہرے (اور عدم اطاعت احکام الٰہی) کے باعث اِن کی مایوسی کا سامان کردیا۔ آخر ان کی قوم کو چالیس سال تک اِنتظار کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ ایک بالکل نئی نسل پیدا ہو، جس کی بچپن ہی سے ان کی نگرانی میں تعلیم وتربیت ہو، اور پھر اس نئی نسل کی مدد سے وہ ارضِ موعود کو فتح کریں۔ گو اِسی اثناء میں حضرت موسیٰ نے وفات پائی اور اِن کی چہل سالہ تربیتی اسکیم اِن کے بعض فیض یافتوں نے مکمل کی۔ حضرت موسیٰ کے زمانے میں جو فرعون مصر تھا، وہ قرآنی تذکرے کے مطابق ایک خاصا باقاعدہ حکمران تھا۔ جس کا ایک وزیر تھا اور جس کے مشورے کے لئے معمرین اور اہل الرائے لوگوں کی ایک مجلس بھی پائی جاتی تھی۔ اس مجلس کے اجلاسوں کی جو روئداد قرآن مجید (۷/۱۱۱ اور ۲۶/۳۶) میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے نہیں کیا کرتی تھی بلکہ اس کے مشورے مناسب اور قابل عمل ہی ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت موسیٰؑ وہارونؑ سے اُن کی جدّت طرازیوں کے باعث کیا برتاؤ کرنا چاہئے؟ جب فرعون نے یہ سوال پیش کیا تو مجلس شوریٰ نے نرمی اور اعتدال کا مشورہ دیا تھا۔ اس زمانے میں عوام الناس تک ایک حد تک سیاسی شعور رکھتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ (قرآن مجید ۲۸/۹۱) جب ایک شخص نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی سخت گیری کے باعث ملامت کرنی چاہی، تو اس نے یہ الفاظ کہے تھے کہ

ان ترید الاان تکون جبارًافی الارض ط

ترجمہ: تو تو زمین میں ایک جبّار بن جانا چاہتا ہے، اور اصلاح وفلاح کا کام کرنیوالوں میں سے نہیں ہونا چاہتا۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں مجلس دوگانہ یا مرکّب بادشاہت کا بھی پتہ چلتا ہے جو بنی اسرائیل میں کارفرما رہی۔

طالوت یعنی بادشاہ ساؤل کا قصہ قرآن مجید میں ایک خصوصی دلچسپی کا حامل ہے۔ بنی اسرائیل کو ان کے دشمن نے شکست دے کر ان کے گھروں سے جلاوطن کردیا تھا۔ انتقام کی خواہش نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ پیغمبر سے یہ خواہش کریں کہ اُن پر ایک بادشاہ نامزد کیا جائے جو اُن کو ساتھ لے کر دشمنوں سے لڑ سکے۔

اذ قالوا لنبی لهم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل الله ط والله واسع علیم ٥

"یاد کرو جب موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کہا کہ ہم پر ایک بادشاہ کو مامور کر
تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑ سکیں، اُس (نبی) نے کہا اگر تم لڑنا فرض ہونے کے بعد لڑنے سے انکار
کر دو تو؟ انھوں نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں ہمارے گھروں
سے اور ہمارے بچوں سے نکال باہر کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود جب لڑنا اُن پر فرض کیا گیا تو
ھوں نے روگردانی کی، بجز چند لوگوں کے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔"

"ان کے پیغمبروں نے اُن سے کہا: دیکھو اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں
نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ہمارا بادشاہ بنے؟ ہم اس سے زیادہ بادشاہت کے مستحق ہیں، کیونکہ
وہ مالدار نہیں ہے۔ اس (نبی) نے کہا، اللہ نے اسی کو تم پر فوقیت دی ہے، اور علم و جسم میں اس کو وافر
حصہ دیا ہے۔ اللہ اپنا ملک جس کو چاہتا ہے، دیتا ہے۔ اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو جانتا
ہے۔" (قرآن مجید ۲۴۶ تا ۲/۲۴۷)

علاوہ اور اہمیتوں کے اس اقتباس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مال و دولت یا حسب و نسب نہیں
ہ علم و جسم یعنی سیاست دانی اور بہادری بادشاہت کی اولین ضرورتیں ہیں۔ اس اقتباس سے یہ
م چیز بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں یہودیوں نے مذہب اور سیاست کو الگ چیزیں ہونا
لیم کر لیا تھا، اور نبی کے علاوہ اور نبی کی موجودگی کے باوجود بادشاہ کی ضرورت سمجھی گئی تھی
بادشاہ فرائض نبوت بجا نہیں لاسکتا تھا۔ اور نہ نبی فرائض بادشاہت، البتہ یہ چیز قابل ذکر ہے کہ
لوت یعنی بادشاہ ساؤل کے فوری جانشین حضرت داؤدؑ اور ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت
مانؑ دونوں بادشاہت اور نبوت ہر دو حیثیتوں کے حامل بنے۔ ان کا کچھ تذکرہ ذیل میں کیا
تا ہے۔

حضرت داؤدؑ کا قرآنی تذکرہ بے حد اہم ہے، کیونکہ اس میں فرائض بادشاہت کا (جن میں
ل گستری سب سے اہم ہے)۔ ذکر کیا گیا ہے:-

(الف) وقتل داود جالوت واتاه الله الملك والحكمة٥

''اور داؤد نے جالوت کو قتل کیا، پھر خدا نے اس کو بادشاہت اور حکمت عطا کی''۔

(قرآن مجید ۲/۲۵۱)

(ب) وشددنا ملکه واٰتیناه الحکمة وفصل الخطاب٥

''ہم نے اس کی حکومت کو مضبوط بنا دیا اور اس کو حکمت اور فیصلہ کرنے والی زبان عطا کی''

(قرآن مجید ۲۰)

(ج) یاداود انا جعلنٰک خلیفة فی الارض فاحکم بین الناس بالحق بما نسوا یوم الحساب٥

''اے داؤد! بے شک ہم نے تجھ کو زمین پر ایک نائب مقرر کیا ہے۔ اس لئے لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلے کیا کر۔ اور خواہشات کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تجھے خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے اور جو کوئی خدا کی راہ سے بھٹکے تو اُس کا انجام برا ہوتا ہے، کیونکہ قیامت کے حساب و کتاب کو اُس نے بھلا دیا ہے''۔ (قرآن مجید ۲۶)

حضرت سلیمانؑ کے سلسلے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''اور سلیمانؑ، داؤدؑ کا وارث بنا۔ اگرچہ بیٹا اپنے باپ کا جانشین ہوا تھا، لیکن اس قرآنی تذکرے کا منشا یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹا بطور حق کے بادشاہ بنا ہو، بلکہ یہ محض خدا کی عنایت تھی کہ باپ کی جگہ بیٹے کو بھی حکومت ملی، ورنہ اقتدار کا اصلی سرچشمہ خدا ہی کی مشیت ہے۔ وہ جسے چاہے نوازے، جیسا کہ دیگر آیتوں میں صراحت ہے۔

اِن الارض لِلّٰہِ٥ (الایة)

''زمین اللہ کی ہے وہ اُسے اپنے بندوں میں سے جن کو چاہے دیتا ہے''۔

اِن الارض یرثها (الایة)

''بیشک زمین کے وارث میرے صلاحیت رکھنے والے بندے ہی بنیں گے'' وغیرہ

حکمرانی کے کل پرزوں کی حرکت کا سب سے دلچسپ منظر قرآن مجید میں ملکہ سبا کے تذکرے میں ملتا ہے۔ چنانچہ

قالت یایها الملوا افتونی فی امری ما کنت قاطعة امرًا حتی تشهدون۔۔۔ وهم صٰغِرُونَ٥

"اُس (ملکہ) نے کہا اے سردار! مجھے میرے اِس معاملے میں مشورہ دو، میں تمہاری
موجودگی کے بغیر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کرتی۔ انہوں نے کہا، ہم بڑے طاقتور اور بہادر لوگ ہیں۔ حکم
دینا تیرا کام ہے، اِس لئے تو سوچ کر فیصلہ کر۔ اُس (ملکہ) نے کہا جب کبھی بادشاہ کسی شہر میں
داخل ہوتے ہیں تو اُسے تباہ کر دیتے ہیں اور وہاں کے معززین کو ذلیل بنا دیتے ہیں اور وہ ایسا ہی
کریں گے۔ البتہ میں اُن (حضرت سلیمان کے ملک والوں) کو ایک تحفہ بھیجوں گی اور دیکھوں گی
سفیر کیا واپس لاتے ہیں؟ چنانچہ جب سفیر سلیمان کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ تم مجھے
کے ذریعے سے کچھ مدد دینی چاہتے ہو، جبکہ وہ چیز جو خدا نے مجھے دے رکھی ہے، وہ اِس سے
کہیں بہتر ہے، جو اِس نے تمہیں دی ہے؟ تمہیں تو اپنے تحفے ہی پر ناز ہے۔ ان کے پاس واپس
جاؤ، ہم بیشک اُن کے پاس ایسی فوجیں لے کر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے، اور ہم
ان کو وہاں سے ذلیل کر کے نکال دیں گے۔ اور وہ پست ہو جائیں گے"۔ (قرآن مجید ۳۲ تا ۳۷)

ہر زمانے میں اِس امر کی ضرورت تسلیم کی جاتی رہی ہے، کہ ملت کی رہنمائی کے لئے ایک
قوانین کا مجموعہ بھی موجود ہو۔ قرآن مجید میں اکثر اِس کا ذکر آیا ہے، کہ پیغمبروں کو کتابیں یا صحیفے
دیئے گئے۔ کتاب کے لفظی معنی حکم دینے کے بھی آتے ہیں اور صحیفے سے مُراد دستور العمل ہوتا
ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے سلسلے میں خاص طور سے اِس کا ذکر ہوا ہے کہ جونہی وہ فرعون کی سرزمین
سے نکل کر باہر آ گئے تو خدا نے حضرت موسیٰؑ کو احکام لکھی ہوئی تختیاں (الواح) عطا کیں، جن کی
پابندی بنی اسرائیل پر فرض قرار دی گئی۔ (قرآن ۱۴۵/۷)

ظالم بادشاہوں کے ظالمانہ اور نامناسب افعال کی قرآن مجید میں بارہا برائی کی گئی ہے۔ (
قرآن مجید ۸۰/ ۱۸،۱۸/۴، ۲۸ وغیرہ)

ایک چیز جو قرآنی تذکروں میں خاص طور سے قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ مملکت
سے زیادہ حکمرانِ مملکت کو نمایاں کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مملکت کا ذکر محض ضمناً آیا ہے
اور اِسی وحدت میں بادشاہ کا ذکر ہی سب سے نمایاں ہے۔ کیونکہ قدیم زمانوں میں یہی صورتِ
حال تھی۔ (جاری ہے)

اسلام کا تصور ملکیت

(صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)

اِس امر سے حالات حاضرہ پر نظر رکھنے والا ہر شخص آگاہ ہے کہ دنیا میں اس وقت معاشی حوالے سے دو نظام قائم ہیں ایک سرمایہ دارانہ اور دوسرا اشتراکی، سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد مطلق اور لامحدود ملکیت پر ہے اور اشتراکی نظام معیشت میں نجی ملکیت کا سرے سے کوئی تصور نہیں، تمام ذرائع پیداوار سوسائٹی اور سٹیٹ کی ملکیت ہیں، اسلام کا اپنا ایک تصور ملکیت ہے جو ہر لحاظ سے انسانی فطرت کے مقتضیات کے عین مطابق اور اِنتہائی عادلانہ اور انقلاب پرور ہے۔

اگرچہ انسان شروع دن سے معیشت کا اسیر رہا ہے لیکن اِس کی روش میں جارحیت اِس وقت پیدا ہوئی جب فرانس کا عظیم الشان صنعتی انقلاب برپا ہوا، نئے پیداواری ذرائع کے ساتھ ساتھ نئے معاشرتی روابط اور رشتے استوار ہوئے جن سے نہ تو صرف نظر ممکن ہے اور نہ ہی کل انکار کی پالیسی درست ہے، یورپ میں صنعتی انقلاب کے ظہور سے قبل ممکن ہے کہ طبقاتی اونچ نیچ کو راضی برضا اور تقدیر پرستی کے حوالے سے جائز قرار دیا جاتا ہو لیکن اب انسانیت اِس نقطے پر پہنچ گئی ہے کہ وہ ''وعدہ فردا'' پر ''امروز'' کو ترجیح دینے پر مصر ہے، مظالم اور مصائب کی چکی میں پسی ہوئی مخلوق اب سرمایہ دارانہ نظام کے ''ارباب'' اور جاگیردارانہ سسٹم کے ''پروردگان'' کو مصائب و آلام کے اِس جہنم میں دھکیلنے کی آرزو رکھتی ہے جس میں وہ صدیوں اور نسلوں سے جلتی چلی آ رہی ہے، معاشی افکار و نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے بالعموم کارلائل، اسکن، ملز، آدم سمتھ، ایلے، الفریڈ، رابنسن اور کارل مارکس کے نام سامنے آتے ہیں لیکن اِن سب نے زندگی بھر مغز ماری کے باوجود ابھی تک انسان کو اِس نظام سے آشنا نہیں کیا جو بیک وقت ''انسانیت'' اور ''آدمیت'' دونوں کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہو، یہ اعزاز صرف جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے حصے میں آتا ہے جنہوں نے انقلاب پرور فکر اور انسانیت نواز عمل سے نہ تو انسان کو ''معاشی حیوان'' بننے دیا اور نہ ہی اِسے جزیروں کی مخلوق بنایا جنہیں انسانی تقاضوں کی سرے سے خبر ہی نہ ہو، قیام پاکستان سے لے کر اب تک وقتاً فوقتاً معاشی مسئلے میں جوار بھاٹا پیدا ہوتا رہا لیکن ۸۰-۱۹۷۰ کے عشرے میں یہ مسئلہ تند موج اور تیز لہر بن کر اُبھرا ہے اگر اِس لہر کو راستہ نہ ملا تو کچھ

ب نہیں کہ یہ سب کچھ بہالے جائے حتی کہ دین، اخلاق، روایات اور ملکی سالمیت (اللہ نہ کرے ایسا ہو)۔

یہ انتہا پسندی اِس وقت شدید صورت اختیار کر لیتی ہے جب اسلام جیسے عادلانہ اور انسانیت پرور دین کی تعبیر کرنے والے اِسے سرمایہ دارانہ نظام کا ضمیمہ بنا کر رکھ دیتے ہیں، اور ان پیشہ ور مفسرین کی چونکہ روٹی کا بندوبست مستقل ہے۔ اِس لئے انہیں مستقبل کے خطرات کا نہ تو احساس ہے اور نہ ہی وہ ''جہان نو'' کے تقاضوں سے واقف دکھائی دیتے ہیں، گذشتہ دنوں ایک مسلک کے رہنما نے جماعت اسلامی کے اصولوں سے روگردانی کی ہے حالانکہ راقم الحروف کی نظر میں جماعت اسلامی کا یہ بہترین، معقول، اور دین اسلام کی روح کے عین مطابق فیصلہ ہے۔

ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ دین اسلام کو ہم نے ''مذہب ثواب'' کے طور پر جانا اور لوگوں سے منوایا ہے مگر اِسے ''دین انقلاب'' کے طور پر نہ سمجھا ہے اور نہ لوگوں کو اِس کی تعلیم دی ہے، ہمارے مذہبی ماحول میں ایک بدترین قسم کی تثلیث قائم رہی ہے اور اب تک ہے کہ جب بات نماز، روزے، تسبیح، حج، نوافل، داڑھی اور مسواک کی آئے گی تو زور دیا جائے گا کہ حضور ﷺ کی سنت یہ ہے اور جب بات معیشت کی آئے گی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ، اور دوسرے اصحاب ہمارے لئے حجت ٹھہریں گے اور جب تذکرہ سیاست کا ہوگا تو ہم دور بنو اُمیہ، عہد عباسیہ اور تغلقوں اور مغلوں کی بات کریں گے حالانکہ ہم سب کیلئے اسوہ حسنہ جناب رسالت مآب ﷺ کی زندگی ہے سیاست ہو، معیشت یا معاشرت۔

ہم اگر مسلمان ہیں تو صرف اِس لئے کہ آنحضور ﷺ کو اپنا بلا شرکت غیرے رہبر و رہنما سمجھتے ہیں اور آپ کا اسوہ حسنہ دین و دنیا میں مثالی اور واجب تقلید ہے، تو پھر کیوں نہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، سیاست، معیشت اور معاشرت میں آپ ہی کے اسوہ حسنہ کو واجب الاتباع قرار دیا جائے؟ یہاں یہ سوال پیدا ہونا لازمی ہے کہ حضور ﷺ کا انداز معیشت کیا تھا، مسلمہ اور ثابت شدہ حقیقت ہے کہ آپ نے زندگی بھر زکوۃ نہیں دی جبکہ یہ امر فریضہ ہے اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اتنا کچھ پس انداز ہی نہیں کیا کہ اِس پر زکوۃ عائد ہو، آپ کی وراثت تقسیم نہیں ہوئی جس کا مفہوم سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ آپ نے کچھ جمع ہی نہیں کیا، ہمیں

جرات کر کے یہ کنفیوژن ختم کرنی چاہئے اور طے کرنا چاہئے کہ سیاست بھی محمدی ہو، معاشرت بھی محمدی ہو اور معیشت بھی محمدی ہو۔

دراصل ہمارے ہاں اسلام کے احکام وقوانین کے بارے میں کنفیوژن کی کچھ وجوہ ہیں جن پر غور تو ہم کرتے نہیں اور فتوے چلاتے رہتے ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام درحقیقت کسی ضابطے کا نہیں رویے کا نام ہے جو پوری زندگی اور اس کے تمام شعبوں پر محیط ہے، ہم اِسے قانونی شقوں، فقہی موشگافیوں اور کلامی باریکیوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی حضرت انسان کے مسائل دور ہوں یا نہ ہوں، سوسائٹی کی فلاح ہو یا نہ ہو، عملی پیچیدگیاں ختم ہوں یا نہ ہوں کسی طرح لکھے ہوئے اور مرتب کئے ہوئے قوانین کی آبرو رہ جائے، دوسری وجہ یہ ہے بمشکل تیس پینتیس برس خلافت راشدہ رہی اور لگ بھگ پونے چودہ سو سال تک ملوکیت، آمریت اور انارکی رہی اب ظاہر ہے کہ اِن صدیوں میں نہ جانے کتنے دبیز اور گہرے پردے اِن تعلیمات پر پڑ گئے جو جناب رسالت مآب ﷺ نے پیش کیں اگرچہ اِن کے الفاظ وحروف تو موجود ہیں لیکن وہ ماحول، کیفیت، سوچ اور رویہ اور روح نہیں رہی جہاں اِن تعلیمات کا اطلاق اور انطباق ہو سکے، ضرورت اِس وقت وہ ماحول پیدا کرنے اور شعور اُبھارنے کی ہے جہاں اسلام اپنی تمام رعنائیوں اور دلنوازیوں کے ساتھ نافذ ہو پھر دیکھیں گے کہ کس طرح زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ کئی صدیوں سے اُمت کو ایک مرکز میسر نہیں اور اِدھر اُدھر کی بے کار سرگرمیوں کے باوجود کوئی نصب العین اور واضح اور متعین مقصد پیش نظر نہیں رہا، ہماری تاریخ بھی اِس لحاظ سے اتنی قابل رشک نہیں کیونکہ ہمارے اقتدار کے محلات اپنوں ہی کے خون اور ہڈیوں کے ذریعے اِستوار ہوتے رہے، بنو اُمیہ نے خلافت اِسلامی کے خلاف سازش کی، اور کھلم کھلا بغاوت کر کے ملوکیت قائم کی۔ بنو عباس نے بنو اُمیہ کی ہڈیاں پیس ڈالیں، اِسی طرح سلجوقی، خلجی، بلودھی، تغلق، مغل، سوری، ابدالی اور عثمانی اپنی پوری زندگیاں ایک دوسرے کی حکومتوں کو تہس نہس کرنے، اُنہیں اُکھاڑنے پچھاڑنے اور اِن کو ملیامیٹ کرنے میں کھپاتے رہے، جس طرح اِنفرادی طور پر کوئی بے روزگار اور آوارہ نوجوان ہر آئے دن کسی نہ کسی سے لڑتے جھگڑتے پکڑا جاتا ہے اور جرم کرتا نظر آتا ہے اِسی طرح ہم بے کار اور لامرکزیت کے روگ میں مبتلا ہونے کے

باعث برگ آوارہ بن کر رہ گئے، اِس عرصے میں نہ جانے کتنے دفتر اور دستاویزات مختلف حکومتوں کی خواہشات کو پورا کرنے اور اِن کے عہد جبر کو طول اور دوام دینے کی خواہشات کو پورا کرنے اور اِن کے عہد جبر کو طول اور دوام دینے کے لئے تیار ہوئے جو بعد میں ہمارے نزدیک مقدس سرمایہ بن گئے، ظاہر ہے اِس وقت وہ دفتر بے معنی ہمارے کام کا نہیں بلکہ روح محمد ﷺ کو صدا دینی چاہئے شاید اِس سے اُمت کی چارہ سازی ہو سکے۔

ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے فلاں صاحب کی کیا رائے ہے؟ بس اِسی اُدھیڑ بن میں ہماری عمر گزر گئی اور ''یاران تیز گام'' نے ''محمل'' کو جالیا۔

جب کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حد ملکیت کا کوئی تصور نہیں اور اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی کی بے تحاشا جائیداد چھین لے تو نجانے یہ کس اصول، کس منطق اور دلیل سے فتویٰ جاری فرما دیا جاتا ہے، غریب بھوکا مر جائے لیکن کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ امراء کی جائیداد اپنے ہاتھ میں لے سکے، لے دے کے صدقہ خیرات رہ جاتا ہے، میرے خیال میں اِن ملایان کرام کی اپنی جو عادت صدقہ خیرات پر پلنے کی ہے تو یہ ساری دنیا کو اِسی مد سے پالنا چاہتے ہوں، کتنا خوفناک ہوگا انجام اِس سوسائٹی کا جہاں لاکھوں انسانوں میں دو چار کو دنیا کی تمام سہولتیں حاصل اور پشت در پشت اِن مراعات کے مستحق چلے آ رہے ہوں اور باقی لاکھوں انسان اِن کے ہاتھ اور کمائی کی میل کھانے پر اکتفا کرتے ہوں۔

ہمارے مذہبی رہنماؤں کا شروع سے وطیرہ یہ رہا ہے کہ اِن کے نزدیک ہاتھ کاٹنے کی حد تک منطقی نتیجہ معاشرے میں چوری کا ہونا ضروری ہے اِن کے خیال میں چوری نہ ہوئی تو قطع ید کی سزا پر کیسے عمل ہوگا؟ سنگسار کرنے کی سزا کا مطلب معاشرے میں زنا کا ہونا لازمی ہے ورنہ حد بیچاری تو معطل ہو کر رہ جائے گی، اِس طرح زکوٰۃ صدقات کے احکام کا مطلب معاشرے میں انسانوں کی بھوک ننگ ضروری ہے ورنہ یہ احکام کہاں جائیں گے؟ حالانکہ اِن سزاؤں اور احکام کا مقصد اور روح یہی ہے کہ معاشرے میں چوری نہ ہو، زنا نہ ہو اور بھوک ننگ نہ ہو، اِسے کہتے ہیں کتابی طرز عمل رہا انقلابی فکر و عمل، جب ہم کتابی بحثوں سے آگے جا ہی نہیں سکتے تو انقلابی کیسے بنیں گے؟

قرآن مجید کا ایک بنیادی اصول ہے کہ **لیس للانسان الا ما سعی** (انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ محنت کرتا ہے) لیکن اب محنت کش بھوکے مرتے ہیں اور مفت خورے عیش میں رہتے ہیں اور اِن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ پیدائش کے ساتھ ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بن جاتا ہے۔

ہمارے ہاں یتیم کا مطلب ہوتا ہے کہ جس کے والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں نہ ہوں وہ بے چارہ ترس، رحم، مدد اور محبت کے قابل سمجھا جاتا ہے، لیکن داؤد، سہگل وغیرہ کی اولاد آج تک نہ یتیم کہلائی ہے اور نہ مدد کی مستحق، جبکہ بعض ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیموں سے زیادہ مظلوم اور رحم کے مستحق ہوتے ہیں، تو کیا ہم کتابیں اور لغات دیکھ دیکھ کر معاشرے کو بدلیں گے یا کھلی آنکھوں سے مسائل کو دیکھنے کی بھی عادت ڈالیں گے؟

یہ کہنا کہ جائز ذرائع سے کوئی کروڑوں کی جائیداد بنالے تو کیا مضائقہ ہے؟ ویسے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ ثابت تو کیا جائے کہ کروڑوں کی جائیداد جائز ذرائع سے بنتی کیسے ہے؟ اور پھر بھوک ننگ کے مارے ہوئے اور درد والم کے ستائے ہوئے لوگوں کی موجودگی میں جمع کیسے رہ جاتی ہے؟ دو ہی باتیں ہیں یا تو کروڑوں کی جائیداد ناجائز ذرائع سے حاصل ہوتی ہے اور یا پھر سنگدل ہونا لازم ہے ورنہ بھوکے بھی ہوں اور کروڑوں کی جائیداد بچ بھی رہے یہ آگ اور پانی کو جمع کرنے والی فلاسفی اور منطق ہے۔

ہمارا معاشرہ ذہنی اور عملی طور پر دوہرے معیار کا حامل ہے وہ تعریف فقر کی کرے گا لیکن حمایت امارت کی، اِس کے نزدیک ولی اللہ متقی، پرہیزگار اور بزرگ وہ ہے جو تہی دست ہو لیکن خود ایک پائی کی کسر نہیں کھائے گا، بزرگوں کی حمایت میں مناظر کرے گا فتوے لگائے گا لیکن اِن جیسے اطوار خود کبھی اختیار نہیں کرے گا، یہی ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی کمزوری بلکہ بیماری ہے، جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے جائیداد از قسم سرمایہ اور جاگیر پر کوئی پابندی نہیں لگائی تو عملی طور پر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انسانوں سے آباد اِس کائنات میں کتنے لوگ ہیں جو سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں بمشکل تمام بیس لاکھ افراد اِس صف میں شامل ہوں گے جبکہ کل آبادی لگ بھگ چار سو کروڑ یعنی چار ارب بنتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب بالخصوص اسلام اِن چند جاگیر اور سرمایہ کے مالکوں کی فلاح اور تحفظ کی بات کرتا ہے یا کروڑوں بھوکوں، ننگوں، مفلسوں،

بیماروں، محتاجوں، مسکینوں، بے روزگاروں اور معذوروں کی فلاح کا بھی کوئی پروگرام پیش کرتا
ہے؟ ہماری تعبیر اور تفسیر سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب عالم شاید متشکل ہی اس لئے ہوئے
ہیں کہ وہ آرام میں رہنے والوں کو تحفظ دیں اور بے قرار انسانوں کی کھیپ یوں ہی نان شبینہ کو ترستی
اور تن ڈھانپنے کی کشمکش میں مستقل طور پر اُلجھی رہے، آخر یہ زاویہ فکر کس اعتبار سے مخلوق خداوندی
کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا ہوسکتا ہے؟ کچھ احکام اگر صدر اسلام میں ایسے ملتے ہیں یا مثالیں نظر
آتی ہیں تو یہ کہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ایسا قیامت تک ہونا چاہئے۔ حضور ﷺ پر دین مکمل
ہونے کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ دور ملوکیت کے سارے پشتارے دین اسلام کا حصہ سمجھ لئے
جائیں، بیسیوں مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے فکر و عمل سے یہ نشاندہی فرمادی کہ
بالآخر یوں ہونا چاہئے لیکن آپ کے دور میں حالات اور مقامی مجبوریوں کے باعث ایسا نہ ہوسکا
آپ کی زندگی میں غلامی کا ادارہ قطعی طور پر ختم نہ ہوا اب اِسے قیامت تک غلامی کے جواز کے
لئے پیش کرنا پرلے درجے کی بدمذاقی اور کوڑھ مغزی ہے، لیکن انسانیت بالآخر اِس نقطے پر پہنچ گئی
جہاں حضورؐ اِسے لے جانا چاہتے تھے کہ غلامی اور انسانوں کی خرید و فروخت کا کاروبار بند ہوگیا
ب اگر کہیں ایسا ہوتا ہے تو ظلم و جبر کی دیگر قسموں کے طور پر ہوتا ہوگا اِس کا کوئی اخلاقی اور قانونی
واز کسی ریاست اور سوسائٹی میں موجود نہیں، اِس دور میں کوئی ہونق قسم کا مذہبی آدمی احادیث اور
ے لے کر بیٹھ جائے کہ غلامی اب بھی جائز ہے کیونکہ حضور ﷺ کے دور میں بھی اور احادیث اور
ے سے ثابت ہے تو ایسے آدمی کے دشمن علم و خرد اور جہنمی ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ ایسا ہی
سئلہ سرمائے اور زمین کا ہے، اِسے کتابی طور پر دیکھا جائے تو شائد قیامت تک یہ مسئلہ اِسی طرح
ہے گا یعنی ظالم ظلم کرتے رہیں اور مظلوم ظلم سہتے رہیں، جاگیردار مزارع کے جسم، محنت اور عزت
استحصال کرتا رہے، سرمایہ دار مزدور کو فاقوں کی نوبت تک پہنچاتا رہے، کچھ لوگ دنیا ہی میں
ت کا لطف لے لیں اور کچھ لوگوں کو اِسی دنیا میں جہنم کا ذائقہ نصیب ہو یہ سب کچھ ایسے ہی ہوتا
ہے گا لیکن اگر مسئلہ حل کرنے کی خواہش اور ضرورت ہے تو دنیا میں کونسا مسئلہ لاتحل ہے۔
طلوب صرف یہ ہے کہ ذہن صاف ہو، دل پاک ہو، ضمیر زندہ ہو اور سینے میں کسی مظلوم کا درد ہو۔
آخر دارا و سکندر اور مزدور اور محنت کش کو دنیا میں ضرورت کس چیز کی ہے یہی کہ انہیں دو وقت
باعزت کی روٹی، کپڑا، مکان، صحت، تعلیم، ٹرانسپورٹ سب کچھ مل جائے اِس سے زیادہ کی طلب

اور خواہش دو امور پر مبنی ہے یا تو عیش کوشی کیلئے یا استحصال کے لئے کم از کم آخرت پر ایمان رکھنے والی اُمت کو شرم آنی چاہئے کہ وہ ان ضروریات کے پورے ہونے کے بعد بھی کسی ہوس اور حرص میں مبتلا ہو، کوئی بھی شخص نہ تو سونے کی روٹی کھاتا ہے اور نہ چاندی کا پانی پیتا ہے۔ تو پھر اس ہوسنا کی میں تقدس کیسے پیدا ہو گیا؟ ایک مسلمان عیش کوش بھی نہیں اور استحصال کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تو جائیداد بنانے اور سرمایہ سمیٹنے کا آخر مدعا کیا ہے؟ کروڑوں روپے گننے کا شوق؟ دوسروں پر رُعب جمانے کی خواہش؟ استحصال کا پروگرام؟ عیش اور لذت کا حصول؟ دنیا بھر کو بھوکا اور ننگا اور اپنے آپ اور خاندان کو خوشحال دیکھنے کی آرزو؟ بتایا جائے کہ ان میں سے کیا مقصود ہے، جس شریعت کے فتوے کے مطابق پیشاب کا ایک چھینٹا پلید ہے، ٹخنے سے شلوار اُوپر رکھنا مستحب ہے، عمرہ کرنا ثواب ہے، داڑھی بڑھانا واجب ہے، اِسی شریعت کی نظر میں رزق حلال ہونے کے باوجود حرام ہے جس سے اپنا پیٹ تو بھر جائے اور دوسرے بھوکے رہیں، آخر ان تعلیمات کو محض اخلاقی وعظ کا درجہ کیوں دے دیا جاتا ہے اور مسواک اور وضو کے مسائل کو قانون اور واجب کا مرتبہ کیسے مل جاتا ہے؟ یہ شتر گربگی کس قاعدے ضابطے سے جائز اور روا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انسان کا ذاتی مفاد اور اِس کی شخصی دلچسپی نہ ہو تو وہ کام کیوں کرے گا؟ اگر شخصی مفاد ہی کام کا محرک ہے تو آخرت کے وعظ، ایثار کی تلقین، احساس ذمہ داری، ادائیگی فرض یہ سب کچھ افسانہ لگتا ہے، حب الوطنی کے دعوے، ملک وملت کے مفاد کی باتیں تو پھر سراسر گپ شپ ہی ہے، اگر کوئی شخص بغیر ذاتی منافع کے کام کرنے کا روادار نہیں تو ایسے شخص کو انسانوں کی بستی سے ویسے ہی نکل جانا چاہئے اِسے درندوں کے بھٹ میں رہنا چاہئے، ایسا سنگدل، مفاد پرست اور ذات پسند انسان سوسائٹی کے کس کام کا؟

کام کرنا پڑے گا ہر شخص کو اپنے لئے بھی دوسروں کیلئے بھی اور ملک وملت کے لئے بھی تاکہ سب پھلیں پھولیں اور خوشحال رہیں، اگر بات آ کر رُک جاتی ہے حوالوں پر تو حوالے بھی پیش کئے جا سکتے ہیں مگر جہاں حیلے بہت ہوں وہاں حوالے بیچارے کیا کریں گے۔

حضور ﷺ کا اپنا اسوہ حسنہ تو سب کو معلوم بھی ہے اور اِس کا تذکرہ بھی ہم کر آئے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر راست اور تدبر اور ساتھ ہی ساتھ اتباع سنت کے جذبے کو واقف نہیں انہوں نے متعدد ایسے فیصلے کئے ہیں جو تاریخی اور انقلابی ہیں جن کے مطابق اُنہوں

نے بہت سی زمینوں کو ضابطے کے مطابق لوگوں میں بانٹنے کے بجائے اجتائی ملکیت میں لے لیا
ایک بار پھر عملی اعتبار سے دیکھنے کی درخواست کی جائے گی کہ امراء اور غرباء میں کس ہولناک درجے کا امتیاز ہے، اِن کے معیارِ زندگی میں کتنا حشر انگیز فرق ہے اور مجبوروں اور مقہوروں کو کتنے زخم لگے ہوئے ہیں اور ہم ابھی تک کتابی حوالوں میں اُلجھے ہوئے حقیقی اور واقعی مسائل کو مزید اُلجھا رہے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں کچھ وہ لوگ ہیں جو آبادی کے تناسب سے آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں جن کا صرف باورچی خانے کا خرچ ہزاروں لاکھوں کا ہے اور لاکھوں کروڑوں افراد وہ ہیں جنہیں زندگی بھر عزت وآبرو کے ساتھ دو وقت کی روٹی کے حصول کیلئے جاں گسل اور ایمان شکن جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح کچھ لوگ معمولی سے نزلے، زکام کی تکلیف کا ازالہ بھی غیر ملکوں میں جا کر کراتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں وہ ہیں جو ٹی بی کی آخری سٹیج میں داخل ہونے کے باوجود علاج معالجے سے محروم رہ جاتے ہیں اگر علاج کراتے ہیں تو بال بچے گروی رکھنے پڑتے ہیں اگر گھر کی روٹی چلائیں تو پھر ٹی بی کو گلے لگانا پڑتا ہے جو انہیں موت کی وادی میں دھکیل دیتی ہے اِن لوگوں کو ہمارے مفتیوں کی باتیں سمجھ آئیں تو کس طرح؟ شرعی مسئلہ ہے کہ حقوق العباد متعلقہ افرد کی معافی کے بغیر کبھی بھی ساقط اور معاف نہیں ہوتے لیکن یہاں حق کسی کا مارا جاتا ہے اور فتویٰ دینے کا کوئی اور مجاز ہے حالانکہ جس کا حق ہے وہی فتویٰ اور فیصلہ دے کہ تمہاری نظر میں حدِ ملکیت جائز ہے یا نہیں؟ اگر ایسا ہو تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اور ملکیت کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں کوئی آدمی فٹ پاتھ پر نہیں سوتا (کوئی عادی نشہ باز اور پیشہ ور گداگر ہو تو الگ بات ہے) اِس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ہاں مکانوں کی کمی نہیں ہر شخص کسی نہ کسی مکان میں رہتا ہے لیکن جائزہ لیا جائے تو پچاس فیصد لوگ کرایہ دار ملیں گے اور یہ اِس لئے کہ کچھ لوگوں کا ذریعہ روزگار بلکہ آلہ استحصال مکانات ہیں چند افراد کو یہ سہولت حاصل ہو کہ ملک کے ہر بڑے شہر میں ان کے عالی شان محلات ہوں، عمدہ درجے کے ہوٹل اِن کے لئے کھلے ہوں اور دوسری طرف لاکھوں لوگ زندگی بھر کرائے کے عذاب میں گرفتار رہیں یہ کہاں کا انصاف، مروت، اخوت، عدل، رواداری، ایثار اور قانون ہے جس کے تحفظ کیلئے پوری شریعت داؤ پر لگا دی جاتی ہے۔ اِس

کا معنی تو یہ ہے کہ اسلام (معاذ اللہ) انسانوں کے تحفظ کا نہیں بلکہ دولت اور زمین کے تحفظ کا علمبردار ہے، کوئی بھوکا مرے، کوئی دربدر پھرے، کوئی خودکشی کرے، کوئی چوری ڈاکے پر اُتر آئے اور ردِ عمل کے نتیجے میں نفسیاتی مریض بن جائے اسلام کو اِس کی پروا نہیں ایسے مفتیوں کے نزدیک صرف چند جاگیرداروں کی جاگیر اور کچھ سرمایہ داروں کا سرمایہ محفوظ رہے اور اِس کی حفاظت مقدس اور اہم ہے، ایسی سوچ کم از کم راقم الحروف کے نزدیک روح اسلام اور روح محمد ﷺ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

ہمارے خیال میں حد ملکیت کا مسئلہ عقلی اور علمی نہیں بلکہ عملی اور واقعاتی ہے جسے اِس تناظر میں حل کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ آئے دن پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہیں گی اور شاہ ولی اللہؒ کے بقول **فك كل** نظام کا نعرہ بلند ہوگا یعنی سب کچھ اُلٹ دیا جائے گا، نہ فقہیں رہیں گی، نہ علم کلام نہ اخلاق اور مذہب اور نہ ہی اقدار و روایات، ہم آخر کیوں نہ یہ سب کچھ بچانے کی فکر کریں اور چند لوگوں کی جائیداد کی مفت وکالت سے دستبردار ہو جائیں، دنیا میں لذتیں وہ اُٹھاتے ہیں اور جنازہ ہمارا خراب ہوتا ہے، اسلام کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ فلاح انسانیت کا ہے، مخصوص ضابطوں کے اِستحکام کا نہیں اسلام کے عبادات، معاملات اور اخلاق کے جملہ ضابطے بھی انسانی سوسائٹی کی ترقی، فلاح اور خوشحالی کے لئے ہیں نہ کہ اِسے جامد، متحجر اور بے فیض بنانے کے لئے!

اسلام اور پیغمبر اسلام کی روح یہ کہتی ہے کہ۔

ا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔

۲۔ زمین و آسمان کی ساری گردش خلیفہ اللہ فی الارض (انسان) کی زندگی کو آسودہ اور کار آمد بنانے کے لئے ہے۔

۳۔ انسان کی پیدائش اور موت کے طریق کار میں قدرت نے کوئی فرق اور امتیاز نہیں رکھا۔

۴۔ زمین کی جملہ اشیاء انسانیت کی تعمیر و ترقی اور انسانوں کی بھلائی کیلئے پیدا کی گئی ہیں۔

۵۔ دین اسلام کو فرد یا مخصوص افراد کے مفادات کے تحفظ کیلئے نہیں بلکہ انسانیت کی اجتماعی بھلائی کیلئے متشکل کیا گیا ہے۔

٦۔ حقوق العباد، حقوق اللہ سے بھی زیادہ اہم اور لائق احترام ہیں۔

۷۔ کوئی بھی انسان دشمن کاروائی از قسم غلامی، استحصال، ظلم، جبر، دراصل حرمت انسانیت کی

نفی ہے اِس لئے یہ جرم بھی ہے اور گناہ بھی۔

۸۔ مسلمان کی اصل متاعِ آخرت ہے دنیا نہیں۔

۹۔ مثالی سوسائٹی وہ ہے جہاں ہر ایک کا مفاد اور نقصان مشترکہ ہو۔

۱۰۔ انسانیت کا کامل اور بہترین نمونہ اسوہ رسول ﷺ ہے۔

۱۱۔ مترفین (اربابِ زر و جاگیر) اور مسرفین (اِستحصال اور تعیش کے عادی) ہر دور میں خدا، انبیاء اور اسلام کے دشمن رہے ہیں۔

۱۲۔ فرعونی سیاست (استبداد) اور قارونی معیشت (لامحدود ملکیت) خدا کی ناپسندیدہ چیزیں ہیں۔

۱۳۔ محنت کے بغیر کوئی شخص کسی صلے کا مستحق نہیں۔

۱۴۔ جسمانی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر معذور لوگ خدا کے مہمان ہیں اِن کی پرورش معاشرے کا فریضہ ہے۔

۱۵۔ دولت سے محبت خدا اور رسولؐ کی محبت سے عملاً قطع تعلقی ہے۔

یہ ہیں وہ موٹے موٹے اصول اور اشارات جن کی روشنی میں طے کیا جا سکتا ہے کہ سوسائٹی کن معاشی بنیادوں پر استوار ہو؟ استحصال یا انصاف کی بنیادوں پر؟

اور اِس سے بھی بڑھ کر یہ غور طلب امر ہے کہ خدا کی ربوبیت جب عام ہے اور بلاشرکت غیرے تمام چیزوں کا مالک ہونے کے باوجود اِس نے رزق کے سرچشموں کو سب کے لئے کھول دیا ہے تو بندے اِن پر پہرے بٹھانے کے کیسے حقدار بن گئے ہیں؟ یہ خدا کی اطاعت ہے یا اِس سے بغاوت؟

اِس بحث کو سمیٹتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر وہ نظریہ مسترد کر دینے کے قابل ہے جس کا مقصد معدودے چند لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا اور عوام الناس کے حقوق اور احساسات کو پامال کر دینا ہو ایسا نظریہ کسی بھی دنیا کے نظام کا حصہ بن سکتا ہے اسلام ایسے عادلانہ، مربیانہ، منصفانہ، مشفقانہ اور انقلاب پرور دین سے اِس کی نسبت بہت بڑی جسارت بلکہ گستاخی ہے، اسلام میں ملوکیت کا کوئی تصور نہیں جتنا کچھ ہے وہ امانت ہے اور امانت کے حوالے سے مسئولیت واجب ہے اور اسی سے معاشرے میں توازن اور اعتدال کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔

نئے سلسلہ کی ضرورت

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

برادرانِ اکرام آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے۔ انقلاب زمانہ سے بہت سے پرانے علوم بے قدر و قیمت ہو جاتے ہیں اور کئی نئے علوم پیدا ہو کر انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ انسانی نظریات میں تغیر آ جاتا ہے اور لوگوں کی سوچ اور فکر کے انداز بھی بدل جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مذہبی عقائد اور تصوف بھی محفوظ نہیں رہتے۔ موجودہ زمانہ میں تو یہ تبدیلیاں اِس قدر شدت اور عجلت سے ہو رہی ہیں کہ علماء اور صوفیاء کی اکثریت مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سوچ اور اندازِ فکر کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مغربی تعلیم اور طرزِ حیات سے متاثر نوجوان ہر بات پر کیوں اور کیا کا جواب چاہتے ہیں اندھی تقلید اُن کیلئے بے معنی سی بات بن گئی ہے۔ وہ قرآن اور احادیث کو نئے علوم کی روشنی میں پرکھنا اور جانچنا چاہتے ہیں۔ اُنہی لوگوں میں سے جو اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے روحانیت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ وہ ترک دنیا اور رہبانیت کی تبلیغ کرنے والے فرسودہ خانقاہی نظام کو کسی صورت قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ موجودہ زمانے کے اکثر و بیشتر صوفی اور پیر علوم حاضرہ سے ناواقفیت کی وجہ سے ان لوگوں کی ذہنیت، نظریات، انداز فکر اور طرزِ استدلال کو نہ تو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کی تسلی کر سکتے ہیں۔ جدید علوم سے آراستہ طبقہ کے لوگ اُمتِ مسلمہ کو دوسری اقوام پر غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اِس لئے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان عبادات اور اخلاق و کردار کے ساتھ ساتھ سائنس و ٹیکنالوجی، تسخیر کائنات اور جنگی قوت میں بھی سب سے آگے رہیں تا کہ دنیا میں اللہ کی مشیت اِس انداز سے نافذ کرنے کے اہل ہو سکیں تا کہ انسانیت معاشی اور سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرے۔ ہر انسان کے لئے بلالحاظ مذہب، قومیت اور رنگ و نسل بنیادی حقوق کی ضمانت ہوں۔ تمام علوم، ایجادات اور انکشافات ساری انسانیت کا مشترکہ ورثہ قرار پائیں اور اِن کی برکتوں سے ہر انسان مستفید ہو سکے۔ جیسا کہ علامہ اقبالؒ نے ارشاد فرمایا۔

نکتہ شرع مبیں ایں است و بس
کس نہ باشد در جہاں محتاج کس

یعنی شریعت کا مقصود و مطلوب ہی ایسا نظام عدل وجود میں لانا ہے کہ انسان کسی بھی دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے انسان پر صرف اللہ کی حاکمیت قائم ہو جائے اور تمام استحصالی نظام جن کی وجہ سے مختلف انسانی گروہ نسل، وطن اور مذہب کی بنیاد پر دوسرے انسانوں کا شکار کھیلتے ہیں نیست و نابود ہو جائیں گے۔

ابھی تک آدمی صید زبون شہر یاری ہے

قیامت ہے کے انسان نوع انساں کا شکاری ہے

یہی وجہ ہے کہ یہ سائنس پڑھنے والوں کو کافر قرار دینے اور علم کو صرف قرآن اور حدیث پڑھنے تک محدود رکھنے والے عالموں اور صوفیوں کے معتقد نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ زندگی کی جدوجہد سے کنارہ کش ہونے کی بجائے بھرپور زندگی گزارنے کا عزم رکھتے ہیں اور اللہ کریم کی پیدا کردہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ اللہ کرنے کے خواہاں ہیں۔ ان کو کسی ایسے سلسلے کی ضرورت تھی۔ جس کی تعلیم اِنتہائی آسان اور مختصر ہو۔ جس میں روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی ترقی اور خوشحالی کے حصول کی ہدایات بھی شامل ہوں۔ جس میں اُخروی فلاح کے پیغام کے علاوہ مخلوق خدا کی خدمت اور اُنکی دنیوی زندگی کو بہترین اور پرآسائش بنانے کا درس بھی موجود ہو۔ جو ایسا لائحہ عمل پیش کر سکے۔ جس پر عمل کر کے ملت اسلامیہ اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔ جس کا ساقی صرف شراب طہوری پلا کر مدہوش کرنے والا ہی نہ ہو بلکہ اس گری ہوئی قوم کو پستی سے اُٹھا کر سوئے منزل گامزن کر دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ جس کی تعلیم ایک طرف قرآن وسنت کے عین مطابق ہو اور دوسری طرف اِس طرح پیش کی جائے کہ ماڈرن تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنیت کی تشفی کر سکے۔ انہیں ایسی روحانی تعلیم کی طلب تھی جو وحدت الوجود کی بھول بھلیوں میں ڈالنے کی بجائے شرک سے یکسر پاک قرآنی توحید کی راہ پر چلائے۔ جو ان میں اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے حصول کا ذوق وشوق بیدار کر سکے اور کرامات کے افسانوں میں گم کرنے کی بجائے، یزداں بکمند آورائے ہمت مردانہ کے مصداق اللہ کے قرب اور دیدار کو انکی منزل ٹھہرائے۔ اس اہم ترین ملی تقاضے کو پورا کرنے کیلئے اللہ رحیم وکریم کی تائید ونصرت سے حضرت خواجہ عبدالحکیمؒ انصاری نقشبندی، مجددی توحیدی نے تصوف کے پرانے اشغال و

اعمال اور مجاہدے کے طریقوں میں مناسب تبدیلیاں کر کے ان کو نئے زمانے کی ذہنیت اور مقتضیات کے عین مطابق ڈھال کر سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی بنیاد رکھی۔ تاکہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوان اور دوسرے راہ گم کردہ طالبان حق دنیا کے سارے کام سرانجام دیتے ہوئے اس آسان ترین تعلیم پر عمل کرتے ہوئے گوہر مراد حاصل کر سکیں۔ اس طرح وہ سب کچھ جو پہلے ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اِس نئے سلسلے کی برکت سے ممکن اور سہل الحصول بن گیا۔ وباللہ التوفیق

مختصر سوانح بانی سلسلہ توحیدیہ:۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے بانی حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ ۲۹ جولائی ۱۸۹۳ء کو جوار دہلی کے شہر فرید آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ پانی پت کے معروف انصار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب صحابی رسولؐ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ جن کو مدینہ منورہ میں حضور نبی کریم حبیب ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حضرت حافظ عبدالرحیمؒ تھا۔ آپ کے دادا مولانا عبدالعزیزؒ جو جج کے منصب علیا سے ریٹائر ہوئے نہ صرف ایک جید عالمِ دین تھے بلکہ ایک کامل ولی اللہ اور مردحق آگاہ تھے۔

اُنہی کے تربیت کے فیض سے آپ کو تصوف کا جذب وشوق اور فقراء سے محبت و موانست کا ذوق ارزانی ہوا۔ آپ پیدائشی ولی اللہ تھے چنانچہ بچپن ہی میں آپ سے کرامات کا ظہور ہونے لگا لیکن آپ ہمیشہ کرامات سے زیادہ تعلیم کو اہمیت دیتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے اُن کرامات میں میرا تو کوئی کمال نہ تھا۔ نہ اِس وقت میں بیعت ہوا تھا نہ ہی اللہ اللہ کرتا تھا۔ یہ تو محض اللہ کا کمال ہے کہ اُس نے جس نہج پر چاہا مجھے پیدا فرما دیا۔

ابھی آپ نے زندگی کی دس بہاریں دیکھی تھیں کہ دادا جان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مگر اُن کی تعلیم و تربیت نے ذہن پر توحید کا بڑا گہرا اثر چھوڑا۔ آپ لڑکپن ہی سے تلاش حق میں سرگرداں رہنے لگے۔ بیسیوں بزرگوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضری دی عجیب و غریب رنگ کے درویشوں سے ملنا ہوا۔ بڑی بڑی درگاہوں اور آستانوں کے سجادہ نشینوں کے پاس بھی گئے۔ لیکن کہیں بھی طبیعت نہ جمی۔ آپ اپنے پہلے خطبہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ مجھے ایک ایسے بزرگ کی جستجو تھی جو شریعت کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ روشن خیال بھی ہو۔ تنگ خیالی سے مجھے بچپن ہی سے کوفت ہوتی تھی جو صاحب علم وعرفان اور صاحب تحقیق ہو۔ کشف و کرامات دکھانے والے تو

بہت مل جاتے ہیں۔ لیکن عارف اور محقق کہاں نظر آتے ہیں۔ آخر کار اِس تلاش وطلب کا نتیجہ نکلا اور بہت اچھا نکلا اور آپ کی ملاقات اچانک اور اتفاقاً حضرت مولانا کریم الدینؒ سے ہوگئی۔ آپ پہلے ہی دن حضرت مولاناؒ کی خدمت میں چھ گھنٹے حاضر رہے اور بیعت ہو کر ہی اُٹھے۔ یہ سعادت آپ کو ۱۹۱۱ء میں حاصل ہوئی۔ جبکہ آپ کی عمر ۱۷ برس کی تھی اور نویں کلاس میں پڑھتے تھے۔

حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ دھوج کے رہنے والے تھے جو دہلی سے کوئی پچیس تیس میل جنوب میں واقع ہے۔ مولانا کسی گدی یا خانقاہ کے سجادہ نشین نہ تھے۔ بلکہ ایک گمنام بزرگ اور ہر لحاظ سے ایک کامل فقیر تھے۔ بیعت ہونے کے بعد آپ نے بڑی جانفشانی اور جوش وخروش سے مُرشد کے بتائے ہوئے اشغال واوراد جاری رکھے اور 23 برس کی عمر میں آپکو سند خلافت عطاء ہوگئی۔ اِس کے ساتھ مُرشد نے یہ ہدایت کی کہ اب تم نوافل تہجد پر بہت زور دو۔ اور جس قدر زیادہ ممکن ہو تلاوت اور تفکر یعنی مراقبے میں وقت گزارا کرو۔ مولانا آپ کو یہ بشارت دے گئے تھے کہ تمہارے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے کہ جب تک تم زندگی میں خدا کو نہ دیکھ لو گے مرو گے نہیں۔ اور یہ بات بھی کہ میرے مرنے کے کافی عرصہ بعد تمہیں ایک دوست ملے گا۔ جس کی صحبت سے تمہارے اندر وہ صلاحیتیں پیدا ہو جائیں گی۔ جو جیتے جی اللہ کا دیدار حاصل کرنے کیلئے لازمی ہیں۔ اِس کے پاس تمہارا حصہ ہے اور تمہارا کام بن جائے گا۔

چنانچہ آپؒ نے اپنے روحانی سفر میں اپنی تصنیف ''حقیقت وحدت الوجود'' میں تحریر فرمایا۔

میں ۱۹۱۱ء میں جبکہ میری عمر ۱۷ سال تھی خاندان نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت ہوا۔ اور سات آٹھ سال کی سخت اور متواتر جدو جہد کے بعد نقشبندیہ سلوک پورا کر لیا۔ اِس سلوک سے طبیعت میں انکسار، تواضع اور کشف وکرامات تو حاصل ہو گئیں لیکن جس مقصد کیلئے بیعت ہوا تھا وہ حاصل نہ ہوا یعنی رویت باری تعالیٰ حاصل نہ ہوئی۔ اِس کے بعد خاندان چشتیہ میں بیعت کی اور پانچ چھ سال میں وہ سلوک بھی طے کر لیا۔ اِس سلوک سے طبیعت میں لطافت، اخلاق میں شیرینی، حسن اور جمالیات کا ادراک اور عشق ومحبت کا سوز وگداز تو میسر آ گیا لیکن رویت باری تعالیٰ یہاں بھی عنقا ہی رہی۔ اِس کے بعد کسی سلسلہ میں بیعت تو نہ ہوا مگر قادریہ اور دوسرے کئی سلسلوں کے سلوک کا مطالعہ بالاستیعاب کیا لیکن رویت کے حصول کا وہاں بھی کوئی ذکر نہ تھا۔ اب میں خاموش

ہو کر بیٹھ گیا اور کسی لطیفہ غیبی کا منتظر رہا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اپنا رحم فرمایا اور ایک بزرگ (حضرت رسالدار محمد حنیف خاںؒ) سے ملاقات کرادی حضرت اویسی تھے۔ نہ خود کسی سے بیعت تھے نہ بیعت فرماتے تھے اس لئے بیعت تو نہ ہو سکا لیکن ذکر وفکر اپنے اُسی پرانے سلسلہ نقشبندیہ کا کرتا تھا، اِس مرتبہ سلوک عجیب طرح سے طے ہوا یعنی ناسوت سے ذات بحت تک سارے راستے اور گردوپیش کے ماحول کو دیکھتا ہوا گزرا یعنی پہلے دوزخ کے طبقات دیکھے پھر علی الترتیب اعراف، ملکوت، جبروت، لاہوت اور ہاہوت کی جنتوں کی سیر کرتا ہوا ہو کے نچلے طبقہ میں داخل ہوا۔ یہاں مجھ پر وحدت الوجود کی کیفیت طاری ہوئی جسے جناب ابن عربیؒ نے حقیقت فرمایا ہے۔ الحمد اللہ کہ میں نے یہاں بھی زیادہ قیام نہیں کیا ورنہ میں بھی وجودی ہو کر رہ جاتا۔ جب میں ہو کی اُوپر والی سطح پر پہنچا تو وہاں وہ کیفیت نظر آئی جس کو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ظلیت کہا ہے یہاں سے بھی جلدی نجات مل گئی۔ اِس کے بعد میں کچھ عرصہ عدم میں رہا لیکن برابر آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ عدم کو پار کر کے عالم اَمر میں داخل ہو گیا۔ اور آخر کار ۲۶، ۲۷ برس کی متواتر کوشش کے بعد ۱۹۵۳ء میں اپنے مقصود حیات سے ہمکنار ہوا۔ الحمد اللہ جو چاہتا تھا مل گیا۔ آپ ظاہر پرستی اور رہبانیت کے سخت مخالف تھے۔ اِس لئے نہ تو ساری عمر کبھی فقیرانہ وضع قطع کا لباس پہنا اور نہ ہی گوشہ نشینی اختیار کی۔ آپ نے متاہل اور بھرپور زندگی بسر کی۔ آپ کاروبار بھی کرتے رہے۔ آپ ۱۸ ستمبر ۱۹۴۷ کو دہلی سے ہجرت کر کے بذریعہ ریل لاہور پہنچے اور پھر کراچی چلے گئے کچھ عرصہ پاکستان ائیرفورس کے سٹیشن ڈرگ روڈ اور ملیر کینٹ میں لائبریرین کے طور پر کام کرتے رہے۔ اِسی دوران میں آپ کی صحبت کیمیا اثر نے کئی احباب کو متاثر کیا اور ان کے من کی دُنیا بدل ڈالی ۱۹۵۱ء میں پاک فضائیہ کے ملازم چند طالبان حق کو اپنے دست حق پرست پر بیعت فرما کر رُشد وہدایت کے سلسلے کی ابتدا فرمائی۔ جو اللہ کی تائید ونصرت سے پھیلتا چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں پاک فضائیہ کی چھاؤنیوں میں حلقہ ہائے ذکر قائم ہو گئے۔ پھر ائیرفورس کے بھائیوں کے توسط سے یہ روشنی اُن کے آبائی شہروں، قصبوں اور دیہات تک پہنچ گئی۔ ۱۹۵۵ء میں ملازمت ترک کر کے آپ مستقل طور پر بنوں چلے گئے جہاں متروکہ جائیداد کے عوض آپ محلّہ قصاباں میں مکان نمبر 746/C الاٹ ہو گیا۔ وہاں آپ نے حلقہ کی باقاعدہ تنظیم کی اور اِس کا نام سلسلہ عالیہ توحیدیہ رکھا اور اِس کی تعلیم کی اساس و بنیاد خالص توحید پر رکھی۔ اِسی دوران میں آپ نے

مشہور کتاب تعمیر ملت تصنیف فرمائی۔ جس سے ہزاروں طالبان راہ خدا نے فائدہ اُٹھایا اور اب بھی مستفید ہو رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آپ نے سلسلہ کے اذکار و اشغال اور آداب و قواعد کو، طریقت توحیدیہ کے نام سے قلمبند فرمایا۔ یہ کتاب سلسلے میں شامل مریدین کے نجی اِستعمال کے لئے ہے اور اِسے سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے آئین کی حیثیت حاصل ہے۔

۱۹۸۶ء میں آپ بنوں سے ترکِ سکونت کر کے لاہور تشریف لے آئے اور بنوں والا مکان فروخت کر دیا۔ قیام لاہور کے دوران حقیقت وحدت الوجود تحریر فرمائی۔ جو اِس موضوع پر مختصر مگر فیصلہ کن دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سالانہ اجتماعات پر اپنے مریدین کی تربیت اور راہنمائی کے لئے جو خطبات ارشاد فرمائے تھے وہ سب کتاب کی صورت میں "چراغ راہ" کے نام سے اکٹھے کر دیئے ہیں ان میں سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے اغراض و مقاصد تفصیل سے درج کرنے کے علاوہ راہِ سلوک کے پیچ وخم، اِس میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا بیان ہے۔ اور صدیوں سے حل طلب روحانی گتھیوں کو سلجھایا اور ذات کریم کے مسافروں کے لئے ایسے ایسے نادر نکات بیان کئے ہیں کہ یہ گیارہ خطبات حریم ذات کے مسافروں کیلئے منارہ ہائے نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لاہور میں قیام کے بعد آپ کے عقیدت مندوں اور اکتساب فیض کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آپ کی ذات مجسم اخلاق اور سراپا محبت تھی۔ آپ کی محبت کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ ہر ملنے والا یہ محسوس کرتا تھا کہ میرے ساتھ آپ بہت پیار کرتے ہیں آپ بڑھاپے اور علالت کے باوجود رُشد و ہدایت کے کام سے کبھی نہ تھکتے۔ صبح سے لے کر رات گئے تک پریم کی محفل برپا رہتی۔ جس میں آپ تشنگان محبت کو مئے توحید سے نوازتے اور اللہ کے عشق کی آگ سے سینوں کو گرماتے رہتے۔ آپ نے ۱۹۵۱ء میں اُمت مسلمہ کی اصلاح کی یہ تحریک تنہا اور بے سروسامانی کی حالت میں شروع کی تقریباً ربع صدی کی لگاتار محنت اور اللہ کے فضل وکرم کے نتیجے میں آپ تعلیم یافتہ صوفیوں کی ایک منظم جماعت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

جو اُن کی تحریک کو اُن کے آئین کے مطابق آگے بڑھانے میں سرگرم عمل ہے۔ کوئی بزرگ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو آخر کار ایک دن تو اُسے اللہ کے ہاں لوٹنا ہی ہوتا ہے۔ البقاء اللہ آپ

بھی مختصر علالت کے بعد ۲۳ جنوری ۱۹۷۷ء کو اپنے خالق و مالک اور محبوب حقیقی سے جا واصل ہوئے۔ ہزاروں سوگواروں اور اشکبار آنکھوں نے آپ کو الوداع کیا اور آسمان سے اللہ کی رحمت کی برستی پھوار میں لاہور ہی میں سپردِ خاک کئے گئے۔

اِنا للّٰہِ واِنّا الیہ راجعون ہ

سلسلہ توحیدیہ کی وجہ تسمیہ:۔

موجودہ زمانے میں جتنے بھی سلسلے ہیں اُن سبھی میں اِلا ماشاءاللہ پیر پرستی اِس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ اللہ تو کسی کو یاد ہی نہیں آتا قبروں کو سجدے کرنا اُن سے منتیں ماننا اِس قدر عام ہو گیا ہے کہ عوام اِس کو گناہ اور شرک تو کیا برا بھی نہیں سمجھتے۔ زندہ پیر کی عزت میں اِس قدر غلو برتا جاتا ہے کہ نماز کے ادب آداب بھی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہزاروں پیر صاحبان اپنے مریدوں سے خود اپنے آپ کو سجد...ے کرواتے ہیں۔ اِس کا نام اُنہوں نے سجدہ تعظیمی رکھا ہے اور اُس کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ سجدہ سوائے اللہ کے کسی کو بھی جائز نہیں۔ اِن کو اللہ تو کیا رسول اللہ ﷺ بھی شاذ و نادر ہی یاد آتے ہیں۔ اور جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اِن میں زیادہ تو ایسے ہیں جو حضور ﷺ کو اللہ سے بڑھ کر نہیں تو اِس کے برابر ضرور جانتے ہیں۔ آپ کو لاتعداد ایسے مسلمان ملیں گے جو حضور اکرم ﷺ کو خدا کا اُوتار مانتے ہیں یعنی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا خود رسول اکرم ﷺ کی شکل میں زمین پر اُتر آیا تھا۔ حالانکہ اسلام اوتاریت کے عقیدے کو کفر بتاتا ہے۔ الغرض عقائد ہیں تو توحید کے خلاف رسوم ہیں تو مشرکانہ اِس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اِس سلسلہ کا نام ہی توحیدیہ رکھوں۔ تاکہ سلسلہ کے ہر بھائی کو یہ بات ہر وقت یاد رہے کہ میں بحیثیت ایک سچے مسلمان کے خالص توحید کا ماننے والا ہوں۔ مگر یاد رہے کہ توحیدی سے ہماری مراد واحدت الوجود ہرگز نہیں۔ ہماری توحید تو سیدھی سادی وہ توحید ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔

نظریہ پاکستان قرآن حکیم کی روشنی میں

(قاضی محمد زمان خان عباس)

خدا تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے حوالے سے اپنے فرشتوں کو فرمایا (میں زمین پر اپنا خلیفہ چاہتا ہوں) فرشتوں نے گزارش کی کہ اے پروردگار، انسان تو زمین میں خون خرابہ کرے گا، کرے گا۔ ہم ہر لحہ آپ کی تسبیح و تعریف میں سجدہ ریز ہیں۔ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ق فرمایا اور فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا۔ فرشتوں کے سردار نے کہا کہ میں سجدہ نہیں کروں گا اس کہ میں آگ سے تخلیق ہوا ہوں اور آدم مٹی سے۔ اسی دن سے اسے راندہ درگاہ قرار دے دیا اور اسے اجازت بھی دے دی گئی کہ تم قیامت تک اپنی تمام تر شیطانیت کا مظاہرہ کر سکو گے۔ یہ تخلیق کائنات اور حضرت آدم سے ہی دو گروہ، دو معاشرے، دو جماعتیں تخلیق پذیر ہو گئیں۔ حکم کی تعمیل کرنے والی اور دوسری حکم کی تعمیل نہ کرنے والی۔ چنانچہ اختلافات رکھنے والی اقوام کے انبیاء کرام کا سلسلہ جاری و ساری کر دیا گیا۔ حکم کی تعمیل کرنے والی اُمت بھی پہلے ایک تھی۔ واحدہ تھی لیکن اِس میں بھی بعد اختلافات نے جنم لینا شروع کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے بنی انسان ابتدا سے ایک ہی اُمت کے افراد تھے، پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو ئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء اکرام کا سلسلہ شروع فرمایا اور اِن کے ساتھ ضابطہ قانون بھی نافذ فرمایا تا کہ وہ ان ضوابط کی روشنی میں اختلافات کو مٹا سکیں اور اُمت ہ کی شکل اختیار کر سکیں۔ لیکن انبیائے کرام نے خدا تعالیٰ کے احکامات کی روشنی میں یہ فرمایا نی نوع انسان خواہ کتنی بھی نسل انسانی میں تقسیم ہو جائے خواہ وہ تفریق، خون، زبان، رنگ اور کی بنیادوں پر ہو یہ باطل تفریق اور امتیاز ہوگا۔ حقائق پر مبنی تفریق اور تقسیم اور امتیاز فکر و نظر اور و تدبیر یا آئیڈیالوجی پر مبنی ہوگی۔ چنانچہ زندگی کا ہر لحہ ہر نظریہ اور ہر تصور اقدار و ضوابط ندی کے اصولوں کے مطابق استوار ہوتا ہے۔ قران حکیم نے ارشاد فرمایا۔

"خدا تعالیٰ نے تم سب کو تخلیق فرمایا، پھر تم میں سے ایک گروہ نے اسے تسلیم کر لیا"۔ یہی وہ نیت کی تفریق اور امتیاز کا معیار ہے۔ جو قرآن حکیم انسانوں کیلئے پیش کرتا ہے۔ اسی کے بق دو اقوام واضح ہوتی ہیں۔ ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم۔ ایک مومن اور دوسری کافر۔ یہی سفہ فکر و نظر تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ سے علیحدہ ہو گئے۔ کیونکہ دونوں کیفیات

میں نظریہ حیات منی بروحی سے ہم آہنگ نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کے حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ کہنا پڑا۔ (یعنی تم اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کھلی عداوت اور نفرت رہے گی) یہی تفریق اور تقسیم مختلف اوقات اور ادوار میں آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ وحی اور نبوت کی تکمیل ہوگئی۔ چنانچہ رسالت مآب ﷺ کے دست مبارک سے ایسی قوم تشکیل پذیر ہوئی جس نے قرآن حکیم اور احکامات خدا کی پوری کائنات کے نظریہ حیات اور تصور کائنات کی وضاحت کر دی۔ یہی وہ قوم تھی جسے ملت اسلامیہ، اُمت محمدیہ یا جماعت مومنین کے نام سے پکارا گیا۔ لہٰذا ملت اسلامیہ کے اصول بھی واضح کر دیئے گئے۔ نظام حکومت اور قوانین کی صراحت فرمادی گئی۔ ارشاد ربانی ہے۔ (جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہی کافر ہیں 5/44)۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

قرآن نے کئی مقامات میں استفسارات فرمائے ہیں۔ مثلاً یہ کہا گیا (کیا تم غور وفکر نہیں کرتے، کیا تم تدبر نہیں کرتے۔ کیا تم جاننے کی کوشش نہیں کرتے) یہی جاننا اور نہ جاننا یہی فکرو نظر قرآن میں ایک ایسے نظریے کی تخلیق کرتا ہے جو ملت اسلامیہ کی ذہنی، علمی، قومی، سماجی، معاشرتی، سیاسی، دینی اور بین الاقوامی حیثیت کو مکمل طور پر جداگانہ حیثیت میں ممیز کرتا ہے۔ یہی قرآنی تعلیم ہے۔ یہی کیفیت دینی اور ملی اساس کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ قرآن نے مزید فرمایا کہ (ہم نے تمہیں واضح طور پر اِن امور و معاملات سے آگاہ کر دیا ہے اگر تم عقل وفکر سے کام کرو، تو زندگی کے صحیح راستے پر گامزن رہو گے) چنانچہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ امور سلطنت میں کسی کافر کو کبھی مشورے یا حکومت میں شامل نہ کیا گیا۔ حضور پاک ﷺ کی مجلس شوریٰ میں کوئی غیر مسلم نہ تھا۔ خلفائے راشدین کی مجلس شوریٰ میں غیر مسلم کا دخل نہ تھا۔ بلکہ کافر یا غیر مسلم ملت اسلامیہ کا فرد ہی نہیں۔ لہٰذا اسلام اور قرآن کے نزول کے ساتھ ہی بنی نوع انسان دو مختلف نظریات کی زد میں آ گئے۔ ایک نظریہ ایمان والوں کا اور دوسرا نظریہ ایمان نہ لانے والوں کا۔ چنانچہ اولاد آدم دو کیمپوں میں تقسیم ہوگئی۔ شرار بولہبی ایک جانب اور چراغ مصطفویؐ دوسری جانب، اس نظریے نے خون کی نفی بھی کر دی۔ برادری، قبیلے اور ذات پات کو ختم کر کے رکھ دیا۔

چنانچہ قرآن کافروں اور منافقین کے ضمن میں ملت اسلامیہ کو بڑی سختی سے متنبہ کرتا ہے (اِن کے بغض و عداوت اور دشمنی کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اِس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

قرآن کے مندرجہ بالا حوالے سے۔

برصغیر کی تاریخ کو جاننے، سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کریں تو یہ فلسفہ عیاں ہوگا کہ وہ قوم جسے ہندو کا نام دیا جاتا ہے، جس کا دعویٰ تھا اور ہے کہ وہ برصغیر میں پانچ ہزار سال سے آباد چلی آ رہی ہے۔ لہٰذا برصغیر اِس کا مستقل وطن ہے۔ باقی اقوام خواہ کوئی بھی ہوں آدی باسی، ملیچھ، راکھشس اور قابل نفرت ہیں۔ مسلمانوں کی بدقسمتی سمجھئے کہ انہیں ہندوستان میں ایک ایسی برخود غلط قوم کے ساتھ واسطہ پڑا جس کا کوئی حتمی مذہب ہے نہ ضابطہ حیات، اصولی طریقہ زندگی ہے نہ کوئی انسانی اقدار و معیار۔ مسلمانوں نے برصغیر پر کسی نہ کسی طرح، کسی نہ کسی حصے اور خطے میں تقریباً 12 سو سال حکومت کی۔ اِس وقت تک مسلمانوں کے علاوہ تمام اقوام بالخصوص ہندو بہترین چاکر ثابت ہوئے۔ جیسے ہی مسلمانوں کی حکومت کو زوال شروع ہوا ہندو نے کل پرزے دکھانے شروع کر دیئے۔ بقول پروفیسر نور صاحب کہ ہندو بطور چاکر بہت فرمانبردار اور اچھا ہے، مگر بطور حاکم ظالم اور خونخوار ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے نظریہ پاکستان کا آغاز، تشکیل اور ترویج برصغیر میں اِس وقت ہوئی جب مسلمانوں کو زوال و انحطاط کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوؤں کی اصل فطرت کے شاہکاروں کا سامنا کرنا پڑا۔ اِن کے مظالم اور اِن کی گھناؤنی سازشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بالخصوص 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کی داستان بڑی دلدوز داستان ہے۔ جسے مصنفین غربی اور شرقی نے خوب خوب بیان کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' کا مطالعہ کرلیں یا عبدالوحید خاں کی کتاب ''مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ'' کا مطالعہ کرلیں۔ کالنز اور لاپیئر کی کتاب ''فریڈم ایٹ مڈنائٹ'' کا مطالعہ کرلیں۔ کیمبل جانسن کی ڈائری دیکھ لیں۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ''انڈین مسلم'' دیکھ لیں۔ پروفیسر محمد منور کی کتاب ''دیوار برلن'' اور ''ڈائمنشنز آف پاکستان موومنٹ'' بطور خاص مطالعہ فرمائیں۔ چندوشنکروی، دیالوی،

گوپالوں، مہاجنوں، ساہنیوں، دھوتی پرشادوں، چھیاموں، موجودہ خام پائیوں، ایڈوانیوں، ملکانیوں، مشراؤں، بال ٹھاکروں اور بڑے بڑے مہا پرشوں نے اسلام، پاکستان اور مسلمان دشمنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی ہے۔ مولانا حالی نے بھارت کو ''اکال الامم'' کہا ہے۔ وہ کالی دیوی جو ان تمام قوموں کو نگل لے گی جو قبل از تاریخ سے لے کر مسلمانوں کی آمد تک باہر سے آئی تھیں۔ جب وہ قومیں ہندوستان میں آئیں تھیں تو ان کا جداگانہ تشخص، جداگانہ قومیت، جداگانہ مذہب، جداگانہ تہذیب تھی۔ لیکن اِس کے بعد دیکھئے کہ ان کے جداگانہ وجود تک کا نشان اس طرح مٹ گیا گویا وہ کبھی دنیا میں موجود ہی نہ تھیں۔ وہ سب ہندو بن گئیں۔ لیکن ان سب میں مسلمان سخت ہڈی کے نکلے، یہ ہندوؤں کی تمام چالوں کے باوجود ان میں جذب نہ ہوئے اور ان کی یہی سخت جانی تھی جو ہندو کیلئے خارِ پہلو بن رہی تھی۔ مہاتما جی اور ان کے چیلوں کی مسلمانوں کے غم میں یہ دردناک آہیں اور جگر فگار نالے، اِسی کانٹے کی کھٹک کا نتیجہ تھیں پہلے انہیں یہ غم ستا رہا تھا کہ یہ ایک الگ قوم کی حیثیت سے زندہ کیوں ہیں اور اب یہ صدمہ مار رہا تھا کہ یہ شکار ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ چنانچہ ان کے بڑے بڑے مہا پرش اپنی جاتی کے سپوتوں سے للکار للکار کر کہہ رہے تھے کہ دیکھنا یہ کہیں جانے نہ پائیں۔ سردار پٹیل نے مارچ 1942ء میں احمد آباد میں ایک تقریر کے دوران کہا ''جو لوگ ایک جداگانہ قومیت کے متمنی ہیں ان میں سے 90 فیصد وہ ہیں جو اس ملک کی مٹی کی پیداوار ہیں۔ اِس لئے اگر یہ لوگ پھر اپنے اصل میں جذب نہیں کئے جا سکتے تو یہ ان لوگوں کا قصور ہے جن سے نکل کر یہ لوگ الگ ہوئے تھے۔ (طلوع اسلام اپریل 1942)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن حکیم نے کس طرح استفسار فرمایا کہ ساری صورتحال کس طرح واضح ہوگئی۔ (تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ واضح اور کھلی عداوت اور نفرت رہے گی)۔

سیوا جی نے ارجن سنگھ کے نام خط لکھا تھا ''میری تلوار مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہے افسوس صد افسوس کہ یہ تلوار مجھے ایک موقع کے لئے میان سے نکالنی پڑی۔ اِسے مسلمانوں کے سر پر بجلی بن کر گرنا چاہیے تھا، جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ ہی انہیں انصاف کرنا آتا ہے۔ میری بادلوں جیسی گرجنے والی فوجیں مسلمانوں پر تلواروں کا وہ مینہ برسائیں گی کہ دکن کے ایک سرے سے لے کر دوسرے تک سارے مسلمان اِس سیلاب خون میں بہہ جائیں گے اور ایک مسلمان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا''۔ (ویر کشیری شیوا جی مصنف پنڈت نند کمار شرما) سیوا جی اپنے مذموم

ارادون میں ناکام رہ کر دنیا سے چل بسے تو اسی براہمن سرتھ رامداس نے اس کے بیٹے سنبھاجی کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ اس نے کہا کہ" آپس میں محبت سے رہو لیکن اپنے مسلمان دشمنوں کو ڈھونڈ کر اپنے راستے سے ہٹا دو، لوگوں کے دل میں ان ملیچھوں کو بھارت ورش کی پوتر بھومی (مقدس سرزمین) سے نکال کر باہر کرنا تمہارا اُدھارمک (مذہبی) فریضہ ہے، کانو درخت کو تنے سے تو شاخیں خود بخود گر جائیں گی۔ میری بات کو مانو تو میں اٹک کی دیواروں پر مرہٹوں کا جھنڈا نصب کر دوں گا۔ (تاریخ مہاراشٹر از بھائی پرمانند)۔ یہی وہ تعصب تھا جو 16 دسمبر 1971ء کو اپنی صحیح شکل میں رونما ہوا۔ ہمارے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے غدار سیاستدانوں نے ہماری تاریخ اسلام کو کس طرح مسخ کیا جو ایمانی روح سے محروم تھے، جو قرآنی جرات و استقامت سے سرمایہ دار نہ تھے۔ ہمارا ایک بازو ہم سے کٹ گیا چنانچہ اندرا گاندھی نے خطاب و جوشِ فتح میں کہا کہ" آج ہم نے دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے۔ ہم نے ایک ہزار سال کا بدلہ لے لیا" لیکن ہم اندر اور باہر ان کے مخلص حواریوں کو ان کے حاشیہ برداروں کو اس وقت سے یہ باور کرا رہے ہیں اور کراتے رہیں گے کہ اگر پوری دنیا میں ایک مسلمان بچہ بھی زندہ ہے تو دو قومی نظریہ موجود ہے۔ اسلام کا جھنڈا اگڑا ہے یہی دو قومی نظریہ ہے جس نے برصغیر میں اس جذبہ محرکہ کو پیدا کیا جسے نظریہ پاکستان کا نام دیا گیا۔ چنانچہ قائداعظم نے 1944ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔" آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کیلئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کے مطالبے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے"۔ یہی بنیادی مطالبہ نظریہ پاکستان کی ترجمانی کرتا ہے۔ فرمایا گیا۔" اِن کے بغض و عداوت اور دشمنی کی بعض باتیں تو اِن کے منہ پر آ جاتی ہیں لیکن جو ان (کافروں) کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہوتا ہے"۔ درحقیقت برصغیر کی تقسیم ہندو جاتی کے نزدیک ایک پاپ (گناہ) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فلسفہ ان کے دھرم کا حصہ ہے۔ چنانچہ 27 اکتوبر 1929ء کا اخبار" ملاپ" "سکرھ کے جلسے میں مہاشہ پرتاپ سنگھ کی تقریر کا حوالہ دے کر لکھتا ہے۔" گائے ماتا کے گلے پر چھری پھیرنے والوں کے لئے تمہارے دل میں رحم کا کوئی جذبہ نہیں ہونا چاہیے۔ بھیشم کے سپوتو، ارجن کے دلاورو، اگر تم

ایک گائے کی خاطر کراچی سے مکہ تک تمام مسلمانوں کو ختم کر دو تو بھی تھوڑا ہے''۔ تحریک سنگھٹن کے سرگرم اور انتہا پسند رہنما لالہ ہر دیال نے اپنی کتاب ''میرے وچار'' میں لکھا ہے۔ ''افغانستان کوئی جُدا ملک نہیں یہ ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ افغانستان میں ہماری مورتیاں اور مندر کے کھنڈرات آج تک پائے جاتے ہیں۔ جب تک افغان اور سرحدی قبائل کے مسلمان بھی ہندو قوم میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔ اس وقت تک ہمارے ملک کی حفاظت کا پورا پورا انتظام نہیں ہوسکتا۔ تاریخ ہند گواہ ہے کہ ان پہاڑی علاقوں سے ہم کو بہت دکھ پہنچ سکتا ہے۔ مگر اس دکھ کا اندیشہ اس وقت تک ہے جب تک یہ بہادر لوگ اسلام کے پیروکار ہیں اور مسلمان ہیں مگر جب ہم ان کو ہندو بنالیں گے تو یہ خطرہ جاتا رہے گا''۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندو نے صرف تقسیم ہند ہی کو ایک گہرا زخم نہیں سمجھا بلکہ وہ افغانستان کو بھی اپنا حصہ تصور کرتے ہیں اور اصل تکلیف اسلام سے ہے چنانچہ گاندھی نے بھی آخر یہ کہا کہ ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ایک ہندو جب مسلمان ہو جاتا تو وہ بھی بہادر اور دلیر ہو جاتا ہے''۔ یہی وہ جذبہ اسلام ہے جو اس کی مکمل ماہیت بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ انقلاب روحانی انقلاب ہے اگر ہم دوقومی نظریے کو سیاسی تصور کر بھی لیں تو نظریہ پاکستان دراصل نظریہ اسلام ہے، نظریہ قرآن ہے۔ دوقومی نظریے کی سیاسی صداقت کی کوکھ سے جنم لینے والا روحانی نظریہ ''نظریہ پاکستان'' ہے۔ بنائے انانیت کی تاریخ میں پاکستان پہلا ملک ہے جو کسی نظریے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا۔ چنانچہ ہمارے پاکستان میں ایک عرصے سے یہ پروپیگنڈا جاری ساری ہے کہ نظریہ پاکستان، تحریک پاکستان کے دوران کبھی استعمال نہیں ہوا حالانکہ اس کے تاریخی شواہد موجود ہیں اس طرح کا پروپیگنڈا تحریک کے اصل منابع کو مٹانے کی مذموم سازش ہے۔ حالانکہ حضرت قائداعظم نے بذات خود 42-1941ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاسوں میں خطاب کرتے ہوئے نظریہ پاکستان کے الفاظ بارہا استعمال فرمائے ہیں۔ اس ضمن میں رسالہ ''چراغ راہ'' کا نظریہ پاکستان نمبر ایک کامیاب کاوش کا نام ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''پاکستان آئیڈیالوجی'' جو غالباً 1958ء میں چھپی تھی اس موضوع پر سیر حاصل مواد کی راہنمائی کرتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی کتاب ''آئیڈیالوجیکل فاؤنڈیشن آف پاکستان'' میں، میں نے اس حوالے سے تفصیل قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے حضرت قائداعظمؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ کے نظریات کو اس ضمن میں بالصراحت پیش کرنے کی سعی کی

۲۔ نظریہ پاکستان کے مخالفین دراصل پاکستان کی نظریاتی سرحدوں پر حملہ آور ہوئے ہیں جو قیام
پاکستان کے حوالے سے پاکستان کو ملیا میٹ کرنے کی گھناؤنی سازش ہے۔ نظریہ پاکستان
دراصل مطالبہ پاکستان تھا، ایسا مطالبہ کفرستان ہند میں آزادی اسلام کی تجدید کی حیثیت رکھتا
ہے۔ چنانچہ یہ اذان نہ اس وقت ہندو کو قبول تھی اور نہ آج تک قبول ہے۔ یہی نظریہ پاکستان کلمہ
توحید کی ترجمانی اور صدا تھا اور اب بھی ہے۔ یہ ہمارے دین متین کے حق میں حلف وفاداری کی
حیثیت رکھتا ہے۔ جب اکھنڈ بھارت کانفرنس لدھیانہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت مسٹر منشی
نے کی اُنہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ ''تمہیں اس کا علم ہے کہ نظریہ پاکستان کا مفہوم
یہ ہے کہ مسلمان اپنے لئے ایسے مساکن بنائیں جہاں زندگی اور طرز حکومت قرآنی اصولوں کے
سانچے میں ڈھل سکے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ارض ہوگا جس
میں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ ہندو قوم خواہ کتنی ہی بزدل اور غیر منظم کیوں نہ ہو وہ کبھی اسے
برداشت نہیں کرسکتی کہ مسلمان اس قسم کی حکومت قائم کرلیں۔ اس حکومت میں ہندو قوم کے افراد
شمشیر و سناں کا نشانہ بنائے جائیں گے۔ اِن کی عصمت دری اور اِن کے مقدس مقامات کی بے
حرمتی ہوگی'' (مقصد پاکستان: مصنف ظہیر الاسلام فاروقی 5-124) چنانچہ اسلام بطور مذہب
ایک ابدی، مطلق، ازلی اور حتمی پیغام خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا غیر اقوام کے لئے اسے
ہضم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے بیان کردہ اصول سے صاف طور پر نظر آتا ہے
بقول سمتھ ''اسلام مسلمانوں کیلئے ایک مجرد نظریہ نہیں بلکہ ایک ایسا نظریہ ہے جو عمل پر اثر انداز ہوتا
ہے''۔ چنانچہ پاکستان میں نظریہ پاکستان اور تحریک پاکستان دو مختلف عوامل کی صورت میں جلوہ گر
ہے لہٰذا تحریک پاکستان برصغیر کے اِن احوال و کیفیات حالات و واقعات کا نام ہے جو پاکستان
کی نظریاتی ریاست کے قیام میں مددگار ثابت ہوئے۔ نظریہ پاکستان ایک فکر و نظام ہے۔ ضابطہ
حیات اور اقدار کا نام ہے جس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے قربانیاں پیش کیں۔ اور ایک آزاد
وطن حاصل کیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ اور پاکستان کی ترقی، خوشحالی
کے لئے کام کرنے کا جذبہ عطا کرے۔ (آمین) (بشکریہ نوائے وقت)

بواسیر سے نجات

(ابنِ طاہر)

بواسیر دو قسم کی ہوتی ہے، بادی اور خونی، اندرونی بواسیر میں مسّے گہرائی میں اندر کی طرف ہوتے ہیں، جبکہ بیرونی بواسیر کے مسّے کرسی پر بیٹھنے، سواری چڑھنے، اُترنے یا فضلے کی رگڑ کے باعث زیادہ تکلیف دیتے ہیں۔

یہ دراصل پھولی اور پھیلی ہوئی نیلی رگیں ہیں جو مقعد کے نچلے دہانہ پر ہو جاتی ہیں یا اندر سے باہر نکل آتی ہیں۔ یہ اس طرح کی نیلی رگیں ہیں جیسی بعض افراد خصوصاً خواتین کی ٹانگوں پر ہوتی ہے۔

وجوہات:۔ قبض کو اُمّ الامراض کہا جاتا ہے۔ آپ جب بھی قبض کے آثار محسوس کریں، تو فوراً شروع میں دوائی سے پرہیز کرتے ہوئے صرف غذائی علاج پر انحصار کر دیں۔ قبض ہی وہ بیج ہے جو بواسیر جیسے تنومند درخت کا باعث بنتا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ہمارے ہاں غذائی عادتوں میں ایک نمایاں تبدیلی آئی ہے۔ چٹ پٹی، کراری غذائیں، ہمارے دستر خوان کا مستقل حصہ بن گئی ہیں۔ بازاری کھانوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ غذائی عادتوں کے ساتھ ساتھ رہن سہن کے انداز نے بھی کروٹ لی ہے۔ سیر سپاٹا اور گھومنا پھرنا موقوف، اب کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور کیبل نے لوگوں کو کرسیوں پر بٹھا دیا ہے لوگ اب پیدل بھی نہیں چلتے اور سواری کو ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ چلنے پھرنے سے پیٹ کے عضلات اور انتڑیاں فعال ہوتی ہیں بیٹھے رہنے سے اُلٹ نتیجہ نکلتا ہے۔ اِن سب باتوں سے بواسیر کا مرض لاحق ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

علامات:۔ بواسیر کے اکثر مریضوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ انہیں کیا بیماری ہے۔ جب کبھی تکلیف ہو اور خون آئے تو پتا چلتا ہے کہ یہ مرض ہے۔ اس بیماری کی عام پہچان یہ ہے کہ بار بار غسل خانے جانا پڑتا ہے۔ فارغ ہو کر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بوجھ باقی ہے۔ ایسی علامات کے ساتھ طبیعت مکدر رہنا لازمی ہے۔ اِن علامات کو نظر انداز نہ کیجئے بلکہ اپنی غذا کی طرف توجہ دیں، قبض پر کڑی نظر رکھیں۔ کیونکہ قبض ہی بواسیر کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

علاج

طب نبویؐ:۔

نبی کریم ﷺ نے بواسیر سے حتمی شفا کے لئے انجیر تجویز فرمائی ہے۔ ڈاکٹر خالد غزنوی صاحب اپنی کتاب طب نبویؐ اور جدید سائنس کی جلد دوئم میں رقمطراز ہیں کہ اکثر مریضوں کو کسی بھی نسخہ کی بجائے کھانے کے بعد انجیر کے تین ٹکڑے اور ادرک کا مربہ بتاتا ہوں اور مریض خوش و خرم رہتا ہے۔

طب یونان:۔

(1) خونی بواسیر کیلئے ایک عمدہ علاج یہ ہے کہ پھل اندرائن بیس پچیس کلو لے کر اس کے چار چار ٹکڑے کریں اور ایک بڑے گھڑے میں ڈال کر اسے پانی سے بھر دیں۔ اکیس روز تک اس گھڑے کو دھوپ میں پڑا رہنے دیں پھر اس سے ایک لوٹا پانی لے کر روزانہ طہارت کریں۔ گھڑے سے جب ایک لوٹا پانی نکالیں تو اتنا ہی پانی اور ڈال دیں۔ یہ عمل چالیس روز تک کرنا ہے۔ اس سے منہ کا ذائقہ قدرے کڑوا رہے گا مگر ساری عمر کے لئے بواسیر سے نجات مل جائے گی۔

(2) ستیاناسی خودرو بوٹی ہے جو ہر جگہ ملتی ہے۔ برسات میں کثرت سے اُگتی ہے۔ اس کے پودوں کو سایہ میں خشک کر کے جلالیں۔ حاصل ہونے والی راکھ آٹھ گنا پانی میں حل کر کے تین دن پڑی رہنے دیں۔ دن میں تین مرتبہ پانی ہلانا ضروری ہے۔ تین دن بعد پانی نتھار کر اُبالیں۔ جب سارا پانی خشک ہو جائے تو نیچے سفید رنگ کا سفوف نظر آئے گا۔ یہی اکسیر بواسیر یا نمک ستیاناسی ہے۔ اس میں سے محض دو رتی بوقت صبح مکھن یا بالائی میں ملا کر مریض کو کھلائیں۔ بواسیر دور کرنے کی لاجواب دوا ہے۔

(3) یہ نسخہ بھی بواسیر کا تیر بہدف علاج ہے۔ کتھا 60 گرام، پھٹکری 60 گرام، دونوں کو نیم کوٹ کر چھان لیں۔ سفوف کی تین برابر خوراکیں بنائیں۔ تین دن صبح و دوپہر کے درمیان کم از کم پاؤ بھر دہی کے ساتھ ایک خوراک کھائیں۔ یہ آمیزہ چونکہ منہ خشک کرتا ہے لہٰذا پہلے تھوڑے

سے دہی میں ملا کر نگلیں، پھر سارا دہی کھالیں۔ دوران علاج قبض نہ ہونے دیں۔ تین دن کا
یہ علاج عمر بھر کے لئے بواسیر سے چھٹکارا دلوا سکتا ہے۔ یاد رہے کھاڈل کی صورت میں ہو۔
مرہم:۔ گائے کے مکھن کو کسی پتھر کی سل پر رکھ کر اُوپر سیسے کا ٹکڑا اتنا گھسیں کہ مکھن کا رنگ سیاہ ہو جائے۔ بس مرہم تیار ہے۔ کسی ڈبیہ میں سنبھال کر رکھیں۔ مجرب مرہم ہے بفضلہٖ چند یوم میں مسے خشک کر دے گا۔

انگریزی علاج:۔ ایبٹ کمپنی کی تیار کردہ مرہم ٹرونولین (TRONOLANE) بھی اِس مرض میں افاقہ دیتی ہے۔

ہومیو پیتھک علاج:۔ اِس طریقہ علاج میں بواسیر کے مرض کی بہت سی بالمثل ادویات موجود ہیں۔ جو کہ علامات کے تحت تجویز کی جاتی ہیں۔ ہم یہاں عام افادہ کی دوا دویات درج کر رہے ہیں۔

خوانی بواسیر کیلئے! Collinsonia 30 کے پانچ پانچ قطرے صبح، دوپہر، شام دو گھونٹ پانی میں اِستعمال کریں۔ جبکہ خشک بواسیر کے لئے Acsculus Hi 3x کے پانچ پانچ قطرے صبح، دوپہر، شام اِستعمال کریں۔

لوشن! بواسیر کے مسوں پر خارجی اِستعمال کے لئے ایک اونس پانی میں پندرہ قطرے Plantago MajorQ کے ڈال کر لوشن تیار کریں اور صبح، دوپہر، شام مسوں پر لگائیں۔

روحانی علاج:۔ وتروں کی نماز میں مندرجہ ذیل آیات اِس ترتیب سے پڑھئے:۔

پہلی رکعت میں سورہ الکافرون۔

دوسری رکعت میں سورہ نصر۔

تیسری رکعت میں سورہ لھب۔

روزانہ یہ عمل ترتیب سے پڑھیئے اور پابندی کے ساتھ اِنشاءاللہ شفا ہوگی۔

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف



قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے ان میں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔